بھوتوں کا جہاز

شمیم حنفی

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

جنوری ۱۹۹۲ء تعداد ۱۰۰۰ قیمت 7/50

برٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

اِس کہانی کی کہانی

بہت برس گزرے، اب سے کوئی سولہ برس اُدھر، جب ان کہانیوں سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اُن دنوں میں اندور میں تھا۔ ایک دوست کے جی میں آیا کہ بچّوں کے لیے ہندی میں اخبار نکالا جائے۔ سو، بچّوں کا اخبار نکلا اور اس رنگ و روپ کے ساتھ کہ بچّوں کے ساتھ بڑے بھی اسے شوق سے پڑھتے تھے۔ یہ کہانیاں سب سے پہلے اسی اخبار میں چھپیں۔

الف لیلہ کی کہانیاں آپ نے سنی ہوں گی۔ ان میں ایک کہانی سے دوسری، دوسری سے تیسری، تیسری سے چوتھی کہانی کا سرا ملتا جاتا ہے اور واقعات کا تار کہیں ٹوٹتا نہیں۔ یہی حال اِن کہانیوں کا ہے۔ یہ الگ الگ اپنی جگہ مکمّل بھی ہیں اور ایک دوسرے سے جڑی ہوئی بھی ہیں۔

پیامِ تعلیم کے لیے جب مجھے کہانیوں کا ایک سلسلہ تیار کرنے

کی دعوت ملی تو سب سے پہلے اِنھی کہانیوں کا خیال آیا۔ اب میں نے اُردو میں نئے سرے سے اُن کا ترجمہ شروع کیا۔ دو تین قسطیں چھپی تھیں کہ بچّے اور اُن سے زیادہ بچّوں کے بزرگ اس سلسلے کو آگے بڑھانے کا تقاضا کرنے لگے۔ مجھے بھی مزا آنے لگا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ڈھائی برس تک مسلسل یہ کہانیاں پیامِ تعلیم میں چھپتی رہیں۔

کہانی سُننے سنانے کی چیز ہے۔ میری کوشش بھی یہ رہی ہے کہ ان کہانیوں میں لکھنے کے بجائے سنانے کا انداز قائم رہے۔ ہماری پُرانی کہانیوں میں یہ انداز ہمیشہ محفوظ رہا۔

اِن کہانیوں کی اشاعت کے لیے برادرم شاہد صاحب اور ولی صاحب قبلہ کا شکرگزار ہوں۔ اپنی بیٹیوں غزل اور سیمیں کا بھی جو ہر قسط کا ترجمہ چھپنے سے پہلے ہی پڑھتی تھیں اور اُس پر اپنی رائے دیتی تھیں۔

بسیرا
جامعہ نگر، نئی دلّی

شمیم حنفی
یکم جولائی ۱۹۸۱ء

بہت دن ہوئے

بہت دنوں پہلے کی بات ہے، ایک لمبا چوڑا قافلہ ریگستان سے گزرتا چلا جا رہا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی زمین پر ریت بچھی ہوئی اور سر پر نیلا آسمان تھا۔ اور گھوڑوں کی گردن سے

لٹکتی ہوئی گھنٹیوں کی گونج دور دور تک سُنائی دیتی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد کے بادل اڑتے اور سارا منظر چھپ سا جاتا۔ ہوا کا کوئی جھونکا اس بادل کو اڑا لے جاتا تو گھوڑسواروں کے زرق برق لباس اور ہتھیاروں کی چمک دکھائی دیتی۔

سامنے سے ایک سوار دھیرے دھیرے قافلے کی طرف بڑھتا آتا تھا۔ اس کے عربی گھوڑے پر زین کی جگہ چیتے کی کھال پڑی ہوئی تھی۔ گھوڑے کی لگام چاندی کی گھنٹوں سے سجی ہوئی تھی اور گھوڑے کی پیشانی پر رنگین پروں کی کلغی تھی۔ سوار بھی اپنے گھوڑے ہی کی طرح چست، مضبوط اور شاندار نظر آتا تھا۔ اس کے سر پر ایک سفید پگڑی تھی، سنہرے تاروں سے آراستہ۔ پاجامہ گہرے، چمکیلے سرخ رنگ کا تھا اور بائیں کاندھے سے اس نے ایک خوبصورت تھیلا لٹکا رکھا تھا۔ گھنے ابروؤں کے نیچے روشن سیاہ آنکھیں تھیں۔ خوب اُبھری ہوئی ناک اور لمبی کالی داڑھی نے اس کے چہرے کو بہت رعب دار بنا دیا تھا۔ اس وقت جب وہ کوئی پچاس گز کے فاصلے پر رہا ہوگا، اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور پلک جھپکتے میں قافلے

کے پاس آپہنچا۔ دور دور تک پھیلے ہوئے سنسان دشت میں ایک اجنبی سوار کو دیکھ کر قافلے کے پہرے دار چونکے۔ انھوں نے اچانک اپنے نیزے سوار کے سینے کی طرف تان دیے۔

"شکریہ دوستو، اس خیر مقدم کا!" سوار نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

"شاید تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں اکیلا ابھی تمھارے پورے قافلے پر حملہ کر بیٹھوں گا ـــــ!"

پہرے داروں نے سر ہلا کر اپنے نیزے جھکا لیے۔ پھر ان کا کماندار آگے بڑھا اور سوار سے پوچھا ــــ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"اس قافلے کا مالک کون ہے؟" سوار نے دریافت کیا۔

"کئی مالک ہیں ــــ" کماندار ــــ "مکّہ سے کئی سوداگر اپنے وطن کی طرف واپس آرہے ہیں۔ کبھی کبھی اس ریگستان میں لٹیرے قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں اس لیے ہم ان کی حفاظت کر رہے ہیں ــــ"

"مجھے ان سوداگروں کے پاس لے چلو"! سوار نے کہا۔

"ابھی تو یہ ممکن نہیں!" کماندار نے جواب دیا ــــ "وہ لوگ ابھی کافی پیچھے ہیں اور ہم یہاں رک کر ان کا انتظار نہیں کر سکتے۔ لیکن، اگر تم چاہو تو ہمارے ساتھ چلو ــــ

سہ پہر کو جب ہمارا قافلہ پڑاو ڈالے گا تو تمھاری خواہش پوری کر دی جائے گی!"

سوار نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ کماندار کے ساتھ ہو لیا۔ کماندار کچھ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ سوار سے اس کا نام اور ملاقات کا مقصد پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ اس نے سوار سے اگر کوئی بات کرنی بھی چاہی تو اسے سوار نے بس ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔

آخر کار وہ اس مقام پر جا پہنچے جہاں قافلے کو رات گزارنی تھی ——— کماندار نے پہرے داروں کو چوکنا رہنے کی ہدایت کی اور سوار کے ساتھ قافلے والوں کا انتظار کرنے لگا ———

سب سے آگے تیس اونٹوں کی ٹکڑی آئی جن کے کجاوے پر بھاری گٹھر لدے ہوئے تھے اور ہتھیار بند سپاہی ان کی حفاظت پر مامور تھے۔ اونٹوں کے پیچھے خوب صورت گھوڑوں پر اس قافلے کے مالک یعنی پانچوں سوداگر تھے۔ان میں چار خاصے سن رسیدہ اور سنجیدہ دکھائی دیتے تھے۔ پانچواں نسبتاً کم عمر تھا اور صورتاً شوقین مزاج نظر آتا تھا۔ پانچوں سوداگروں کے پیچھے بھی باربردار اونٹوں

اور خچروں کی ایک لمبی قطار تھی۔

خیمے گاڑ دیے گئے۔ اونٹوں اور خچّروں کی پیٹھ سے سامان اتار کر انھیں ستانے کے لیے کھول دیا گیا۔ بیچوں بیچ نیلے ریشمی کپڑے کا ایک بہت بڑا خیمہ نصب کر دیا گیا۔ کماندار نے سوار سے اسی خیمے کی طرف چلنے کی درخواست کی۔

دونوں آگے بڑھے۔ کماندار نے خیمے کا پردہ اٹھایا اور دونوں اندر چلے گئے۔ وہاں پانچوں سوداگر سنہری گدّے دار کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، حبشی غلام ان کے سامنے کھانے پینے کی چیزیں پیش کرنے میں مصروف تھا۔

"یہ تم کیسے لے آئے ہو؟" نسبتاً کم عمر سوداگر نے کماندار سے تحکمانہ لہجے میں دریافت کیا۔

اس سے پہلے کہ کماندار جواب دیتا سوار نے خود ہی بولنا شروع کر دیا ——— "میرا نام سلیم ہے اور میں قاہرہ کا رہنے والا ہوں۔ مکّہ سے واپسی کے سفر میں لٹیروں کی ایک ٹولی نے مجھے قید کر لیا ——— بڑی مشکلوں سے میں تین دن پہلے انھیں چکمہ دے کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔ خدا کا شکر ہے اس قافلے کی گھنٹیوں کی گونج سن کر جان میں جان آئی میری درخواست صرف یہ ہے کہ مجھے آپ لوگ

اپنے ساتھ سفر کرنے کی اجازت دے دیں، میں آپ کی ہمدردی کا مستحق ہوں۔ قاہرہ پہنچ کر میں آپ لوگوں کی اس محبت کے اعتراف کے طور پر آپ کی خدمت میں ایک نذرانہ بھی پیش کروں گا۔ قاہرہ کے وزیراعظم میرے ماموں ہیں۔"

سب سے بوڑھے سوداگر نے غور سے سنا ـــــ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــــ "ٹھیک ہے! ٹھیک ہے! ہم تمھیں اپنے ساتھ لے چلیں گے ـــ اب آؤ! بیٹھو اور ہمارے ساتھ کھاؤ پیو!" ـــ سوار بیٹھ گیا اور ان کے ساتھ خورد و نوش میں شریک ہو گیا۔ دستر خوان، قسم قسم کے لذیذ کھانوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ سب کھانے سے فارغ ہو چکے تو حبشی غلاموں نے دستر خوان سمیٹ کر خوشبودار تمباکو کے تازہ دم حقّے اور تر کی مشروبات کی صراحیاں سامنے

سجا دیں۔ کچھ دیر پانچوں سوداگر اور یہ اجنبی سوار چُپ چاپ ایک دوسرے سے بے نیاز حقے کے کش لیتے رہے، بالآخر سب سے کم عمر سوداگر نے مہر سکوت توڑی اور بولا۔

"ہمیں تین دن اس طرح سفر میں گزر گئے۔ یا تو گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے رہے یا پھر کھایا پیا اور سو گئے۔ وقت گزاری کا کوئی اور طریقہ اب تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اب اس عالم میں میری طبیعت اکتانے لگی ہے۔ یہاں نہ تو رقص و سرود کی محفل آراستہ ہو سکتی ہے نہ ہی دل کو بہلانے کا کوئی اور بہانہ نظر آتا ہے۔ آپ لوگ ذرا غور کیجیے ——— وقت گزارنے کی کوئی اور صورت آپ کے ذہن میں ہے ؟"

چاروں بوڑھے سوداگر تو یہ سن کر خاموش رہے اور بیٹھے اسی طرح لاپروائی سے حقّے کے کش لیتے رہے، لیکن سوار نے ایک تجویز پیش کی ——— بولا:

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ جہاں جہاں ہمارا قافلہ پڑاؤ ڈالے ہم میں سے کوئی بھی ایک دل چسپ قصّہ سنائے اس طرح وقت بھی کٹ جائے گا، تفریح بھی رہے گی!"

"تم ٹھیک کہتے ہو!"، سب سے بوڑھے سوداگر احمد

نے کہا ——— "یہ مشورہ بہت عمدہ ہے!"

"بہت خوب، شکریہ!" سلیم نے جواب دیا۔ "چونکہ یہ تجویز میں نے پیش کی ہے اس لیے سب سے پہلے میں ہی قصہ بھی سناؤں گا!"

پانچوں سوداگر سوار کے اور قریب سمٹ آئے۔ غلاموں نے خالی صراحیوں میں شربت بھر دیا۔ حقّے کا تمباکو بدل کر چلموں میں دہکتے ہوئے کوئلے ڈال دیے۔ سلیم نے شربت کے دو تین بڑے بڑے گھونٹ لیے، اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"اچھا تو پھر سنو! ایک عجیب و غریب واردات۔ یہ قصہ سارس بادشاہ کا ہے۔"

سارس بادشاہ
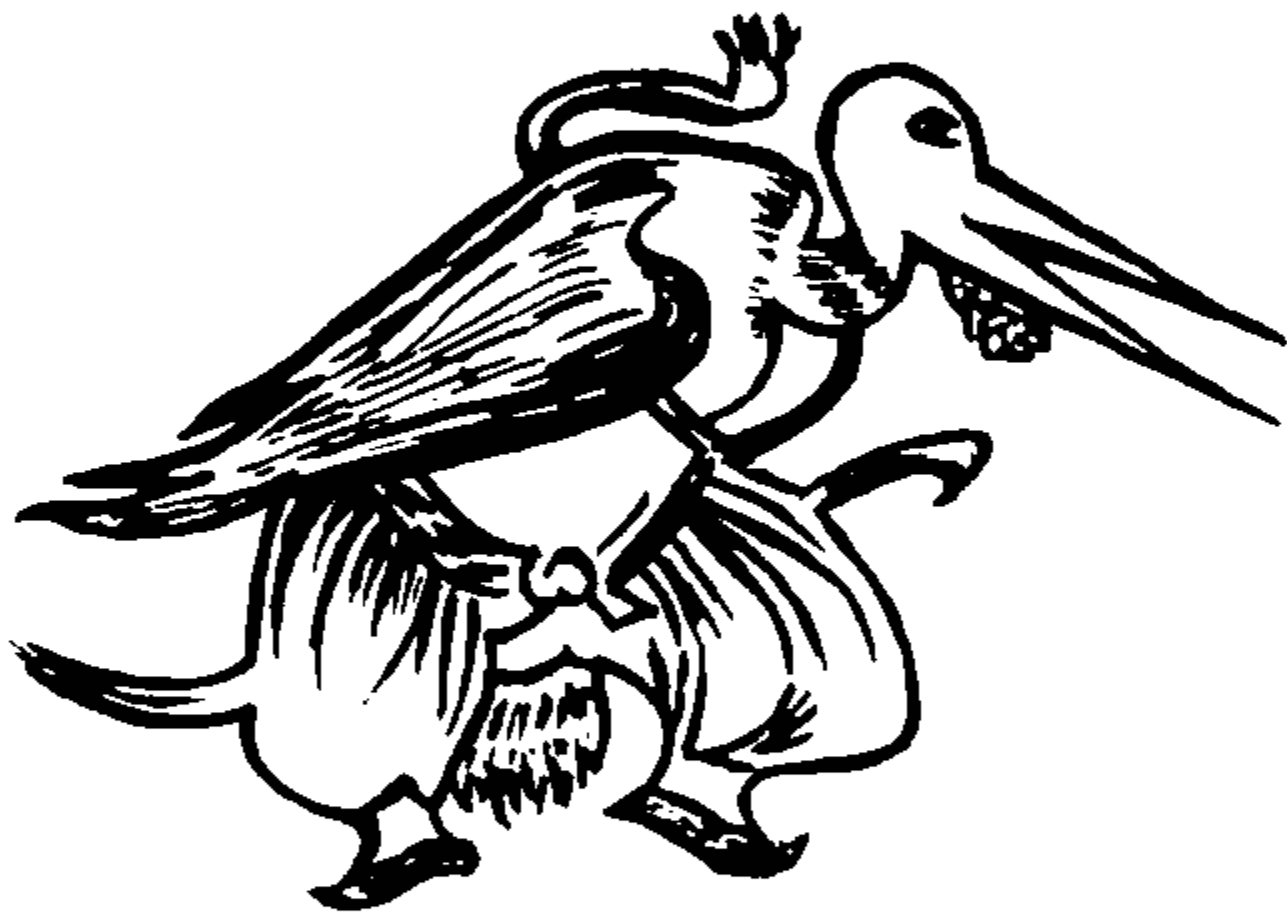
بہت دنوں پہلے کی بات ہے، ایک روز بغداد کے خلیفہ ہارون رشید تیسرے پہر کے وقت دیوان پر مسند سے ٹیک لگائے آرام کر رہے تھے۔ دن بھر کے کام کاج نے انھیں تھکا ڈالا تھا۔ اس وقت وہ قہوے کی چسکیوں کے ساتھ ساتھ حقّے کے کش لگا رہے تھے۔

ان کا وزیر اعظم منصور روزانہ اسی وقت ان سے ملاقات کے لیے آتا تھا۔ آج جب وہ آیا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ خلیفہ نے حقے کی نے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے منصور؟ تم کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو؟"

وزیر نے دھیمے لہجے میں کہا ——— "حضور! مجھے پتہ نہ تھا کہ چہرے سے آپ میرے دل کا حال جان جائیں گے۔ بات کوئی خاص نہیں۔ محل کے باہر ایک سوداگر کچھ بہت خوبصورت چیزیں بیچ رہا ہے۔ میں ان میں سے ایک آدھ خریدنا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت میری جیب بالکل خالی ہے!"

خلیفہ نے ایک خادم کو حکم دیا کہ باہر جاکر سوداگر کو بلا لائے۔ سوداگر چند لمحوں بعد اندر آیا۔ وہ ایک ٹھگنے قد کا موٹا سا آدمی تھا۔ اس کا لباس بہت معمولی اور پرانا تھا۔ اس نے کچھ انگوٹھیاں، جواہرات، جڑاؤ طپنچے، خوبصورت پیالے اور کنگھیاں سامنے رکھ دیں۔ خلیفہ نے وزیر کے لیے ایک طپنچہ خریدا اور وزیر کی بیوی کے لیے ایک خوبصورت کنگھی

اچانک خلیفہ کی نظر ایک ننھے سے صندوقچے پر پڑی جس میں سیاہ رنگ کا کوئی سفوف رکھا ہوا تھا اور ایک کاغذ جس پر کچھ عجیب و غریب سی لکھاوٹ تھی۔

"یہ کیا ہے؟" خلیفہ نے سوداگر سے پوچھا۔

"جہاں پناہ! میں خود نہیں جانتا کہ اس صندوقچے میں یہ کیا رکھا ہوا ہے۔ مکّہ کے ایک سوداگر نے مجھے یہ صندوقچہ دیا تھا۔ آپ کو پسند ہو تو آپ کی نذر ہے۔"

خلیفہ کو پرانی اور انوکھی تحریروں سے خاص دلچسپی تھی۔ اس نے وہ کاغذ لے لیا اور سوداگر کو رخصت کر دیا۔ پھر وزیر سے دریافت کیا ——"کیا تم یہ تحریر پڑھ سکتے ہو—؟"

وزیر نے جواب دیا——"جی نہیں—— مگر بڑی مسجد کے قریب ایک شخص رہتا ہے۔ اس کا نام سلیم ہے۔ اسے بہت سی پرانی زبانیں آتی ہیں شاید وہ پڑھ لے!"

خلیفہ نے اسی وقت سلیم کو بلوا بھیجا۔ سلیم چند لمحوں بعد آ پہنچا۔ خلیفہ نے کہا——"لوگ تمھیں

عالم کہتے ہیں ـــــ اس کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ کر اس کا مطلب بتاؤ! اگر تم کامیاب ہوئے، تو انعام پاؤ گے۔ نہیں تو تمھیں سزا دی جائے گی!"

سلیم نے ایک نظر اس کاغذ پر ڈالی۔ پھر کہا۔
"یہ تحریر لاطینی زبان میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے

کہ جو شخص بھی صندوقچے میں رکھے ہوئے سفوف کو سونگھ کر "معتبر" کہے گا اس کی شکل اپنے آپ اس کی پسند کے کسی جانور کی شکل میں تبدیل ہو جائے گی اور وہ جانوروں کی بولی بھی سمجھنے لگے گا۔ پھر جب وہ دوبارہ انسان بننا چاہے تو مشرق کی طرف تین بار سر جھکا کر اسے لفظ "معتبر" کہنا پڑے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ جانور کی شکل اختیار کرنے کے بعد وہ بھولے سے بھی مسکرانے کی کوشش نہ کرے۔ نہیں تو ہمیشہ جانور ہی رہے گا۔"

سلیم کے خاموش ہوتے ہی خلیفہ نے بہت پرجوش انداز میں اس کو شاباشی دی۔ اسے انعام واکرام بھی دیا اور اس سے یہ عہد کروایا کہ وہ کسی کے سامنے اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں کرے گا۔

سلیم کے جانے کے بعد خلیفہ نے وزیر سے کہا ــــــ
"منصور! یہ تو بہت شاندار چیز ہمارے ہاتھ لگی ہے
کل صبح تم یہاں آجاؤ۔ پھر کسی سنسان جگہ پر چل کر ہم اس
سفوف کا تجربہ کریں گے ــــــ"

دوسرے دن خلیفہ صبح کے ناشتے سے فارغ ہوا
ہی تھا کہ وزیر آپہنچا۔ خلیفہ نے اپنے مسلّح باڈی گارڈ کو حکم
دیا کہ صندوقچہ لے کر اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ کچھ دیر دونوں
محل کے گرد پھیلے ہوئے باغوں میں کسی جاندار مخلوق کی تلاش
کرتے رہے۔ اس تلاش میں ناکامی ہوئی تو منصور نے
مشورہ دیا کہ کیوں نہ جھیل کی طرف چلا جائے۔ وہاں سارس،
بگلے اور دوسرے آبی پرندے ضرور موجود ہوتے ہیں۔

خلیفہ نے منصور کی بات مان لی۔ دونوں جھیل کی
طرف چل پڑے ابھی وہ کنارے تک پہنچے ہی تھے
کہ انھیں ایک سارس نظر آیا جو اپنی لمبی چونچ زمین
پر جھکائے مینڈکوں کی تلاش میں مصروف تھا۔ ایک
اور سارس ہوا میں اڑتا ہوا دکھائی دیا۔

وزیر نے پر جوش انداز میں کہا ــــــ"یہ دونوں
سارس ابھی آپس میں غپ لڑائیں گے کیوں نہ ہم

خود کو سارس میں تبدیل کرلیں۔"

"ٹھیک ہے ــــ!" خلیفہ نے منصور کی تائید کی ــــ "لیکن پہلے ہم یہ اچھی طرح یاد کرلیں کہ جب ہم دوبارہ آدمی بننا چاہیں تو ہمیں کیا کرنا ہوگا ــــ کیوں ــــ؟ ہاں! ہمیں مشرق کی طرف تین مرتبہ سر جھکا کر ایک لفظ کہنا ہوگا ــــ "معتبر" ــــ لیکن یہ خیال رہے کہ کسی بھی طرح ہنسی نہ آنے پائے نہیں تو ہم سارس ہی بنے رہ جائیں گے!"

اتنے میں اوپر اڑتا ہوا سارس دھیرے دھیرے پروں کو سمیٹتا ہوا نیچے اترا۔ خلیفہ نے جلدی سے صندوقچہ کھولا۔ چٹکی بھر سفوف نکال کر سونگھا اور پھر ایک چٹکی بھر سفوف منصور کی طرف بڑھا دیا۔ پھر دونوں مشرق کی سمت تین بار جھکے اور ایک ساتھ چلائے۔

"معتبر!"

اچانک دونوں تیزی سے بدلنے لگے ان کے پاؤں لمبی لال چھڑیوں جیسے ہوگئے۔ پیلے رنگ کی چپلیں سارس کے پنجوں میں تبدیل ہوگئیں۔ بازو ڈینے بن گئے
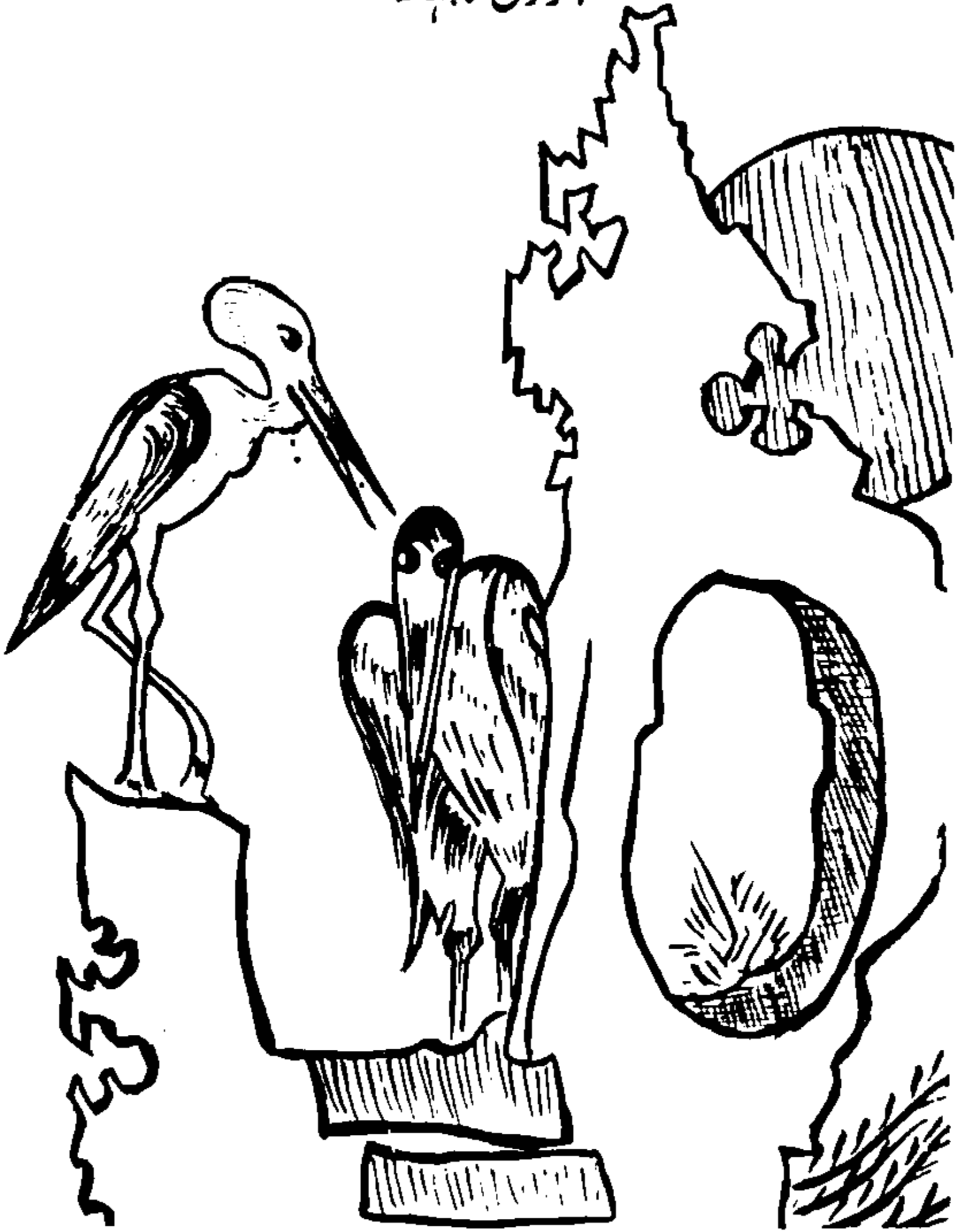
گردن لمبی ہوگئی۔ ڈاڑھیاں غائب ہوگئیں اور سارے
بدن پر نرم نرم سفید پر اُگ آئے۔

"واہ! تمھاری چونچ کتنی خوبصورت ہے! خلیفہ نے تعریفی انداز میں وزیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"شکریہ حضور!" منصور نے بڑے ادب سے کہا۔ پھر بولا ——— "اگر آپ اجازت دیں تو یہ عرض کروں کہ آپ سارس کی شکل میں اپنی اصل صورت سے زیادہ شاندار نظر آرہے ہیں۔ اب ہم ذرا ان سارسوں کے پاس چل کر ان کی باتیں سنیں۔ ذرا یہ دیکھیں کہ ہم ان کی بولی سمجھ پاتے ہیں یا نہیں ——— !"

ہوا میں اُڑتا ہوا سارس زمین پر اترنے کے بعد چونچ سے اپنے پاؤں صاف کر رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے پَر جھاڑے اور دوسرے سارس کی طرف بڑھا۔
"کہو دوست کیا حال ہے ——— ؟" پہلے سارس نے دوسرے سارس سے پوچھا۔
"خدا کا شکر ہے دوست! میں ذرا اپنے ناشتے کا انتظام کر رہا تھا۔ کہو تو تمھیں بھی ایک آدھ مینڈک یا چھپکلی کی ٹانگ پیش کروں ——— !"
"بہت بہت شکریہ بھائی! آج پتا نہیں کیوں بالکل بھوک نہیں ہے۔ میں تو بس یونہی کچھ دیر یہاں

سکون سے گزارنے کے لیے چلی آئی۔ آج میرے والد کے کچھ مہمان آنے والے ہیں۔ مجھے ان کے سامنے رقص کرنا ہوگا۔ تھوڑی سی مشق کرلوں۔"

یہ کہتے کہتے اس نے ناچنا شروع کر دیا۔ خلیفہ اور وزیر انھیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی باتیں سن کر انھیں یہ پتا چلا کہ ان میں ایک سارس نر ہے اور ایک مادہ۔ مادہ سارس اپنی لمبی گردن ہلا ہلا کر بڑے جوش کے ساتھ ناچنے میں مگن تھی نر سارس اس کی طرف تحسین آمیز انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اچانک مادہ سارس نے ناچتے ناچتے اپنی ایک ٹانگ اوپر اٹھالی اور دوسری ٹانگ پر کھڑی ہوکر چک پھیریاں لینے لگی۔ وہ ایک ہی جگہ چکّر کاٹتی جاتی تھی اور اپنے پروں کو پنکھوں کی طرح ہلا رہی تھی۔

اس کو ناچ میں اتنا مگن دیکھ کر خلیفہ اور وزیر دونوں زور سے ہنس پڑے۔ ہنسی کی آواز نے دونوں کو ڈرادیا۔ جلدی سے انھوں نے اپنے پر کھولے اور یہ جا، وہ جا! بڑی مشکل سے خلیفہ اور وزیر نے اپنی ہنسی روکی۔

"واہ بھئی واہ! کیا شاندار رقص تھا!" خلیفہ نے کہا۔
پھر اچانک وزیر کو یاد آیا کہ انھیں ہنسنا نہیں چاہیے

تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"حضور ــــــ!" وہ چیخ کر بولا ــــــ "ہم سے بڑی بھول ہوئی ــــــ ہمیں ہنسنا نہیں چاہیے تھا ــــــ اب ہم شاید دوبارہ آدمی نہ بن پائیں!"

خلیفہ یہ سنتے ہی ڈر سے کانپ اٹھا ــــــ "کیا کیا؟" اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا ــــــ "ہمیں ہنسنا نہیں چاہیے تھا ــــــ ہمیں ہنسنا نہیں چاہیے تھا ــــــ اف! یہ کیا ہوا ــــــ وہ کیا لفظ تھا ــــــ؟ تین بار مشرق کی طرف سر جھکا کر کچھ کہنا تھا نا؟ یاد کرو! کیا لفظ تھا وہ ــــــ؟ ــــــ مع، مع، مع!"

دونوں مشرق کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو گئے ــــــ تین بار اپنے سر جھکائے۔ ہزار کوشش کی لیکن وہ لفظ یاد نہ آیا ــــــ اب کیا ہوگا؟ کیا وہ پھر سے آدمی نہ بن سکیں گے ــــــ؟ دونوں اپنی حالت پر رو دیے!۔

خلیفہ اور وزیر منصور، دونوں سارس بنے، دن بھر کھیتوں میں ادھر ادھر بھٹکتے پھرے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح اپنی اس حالت سے نجات پائیں اور دوبارہ آدمیت کے جامے میں واپس آئیں۔ واپس شہر آنے کی ان میں ہمت نہ تھی۔ بھلا

کون یقین کرے گا کہ وہ سارس نہیں بلکہ خلیفہ اور وزیر ہیں! اگر وہ کسی طرح لوگوں کو اپنی اصلیت کا یقین دلا بھی دیں تو کون چاہے گا کہ ملک کا انتظام دو سارسوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے ــــــ؟

کئی روز تک وہ اسی طرح مارے مارے پھرتے رہے۔ بھوک لگتی تو باغوں میں جا کر پھل کھا لیتے۔ لمبی لمبی چونچوں سے پھل کترنا انھیں بہت مشکل لگتا تھا۔ لیکن چھپکلی یا مینڈک کھانے کے تصوّر سے بھی ان کا جی متلانے لگتا تھا۔ ان کے لیے دل بہلانے کی صرف ایک صورت تھی ــــــ یہ کہ بغداد کی حویلیوں کے اوپر کچھ دیر اُڑ لیں اور اپنے شہر کا حال دیکھ لیں۔

ادھر شہر کے لوگ حیران تھے کہ بادشاہ اور وزیر اچانک کہاں چلے گئے۔ انھیں زمین کھا گئی کہ آسمان۔ ان کے غائب ہونے پر شہر والوں نے تین دن تک ان کا سوگ منایا۔ چوتھے دن اپنی اُڑان کے دوران خلیفہ اور وزیر نے شہر کی طرف نظر ڈالی تو کیا دیکھا کہ ایک شاندار جلوس سڑک پر چلا جا رہا ہے ــــــ ڈھول تاشے بج رہے ہیں۔ جلوس کے آگے آگے ایک

خوب سجا دھجا گھوڑا ہے۔ گھوڑے پر ایک شخص سنہرا زرتار لباس پہنے شان سے بیٹھا ہوا ہے، اس کے پیچھے خادموں کی صف ہے۔ صف سے پیچھے شہر کی آبادی کا ہجوم، اور لوگ نعرے لگا رہے ہیں۔

"مرزا، زندہ باد!"

"شاہ بغداد، زندہ باد!"

خلیفہ اور وزیر نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر خلیفہ نے کہا:

"منصور! دیکھو مجھ پر یہ کیسا قہر نازل ہوا ہے! یہ مرزا جو گھوڑے پر سوار ہے میرے سب سے بڑے دشمن کشنو جادوگر کا بیٹا ہے ایک مرتبہ میں نے جادوگر کو کسی بات پر سزا دی تھی اور اس نے عہد کیا تھا کہ کبھی نہ کبھی پلٹ کر مجھ سے بدلہ ضرور لے گا ——— خیر ——— میں ابھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں ——— چلو ——— ! ہم ایک بزرگ کی قبر پر چل کر دعا کرتے ہیں۔ شاید اللہ ہماری سن لے۔"

دونوں نے ایک سمت اڑان بھری۔ تھکن سے حالت خراب ہو رہی تھی۔ لمبی اڑان کا یہ پہلا موقع تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وزیر کی طاقت جواب دے گئی۔ اس نے ہانپتے

ہوئے کہا ——— " حضور! اب مجھ سے نہیں اُڑا جاتا۔ آپ مجھ سے تیز اُڑتے ہیں۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ پھر شام ہونے کو آئی۔ ہمیں کہیں نہ کہیں رات بسر کرنے کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔ کیوں نہ ہم بقیہ سفر کل پر چھوڑ دیں ؟"

خلیفہ پر بھی تھکن چھائی ہوئی تھی۔ منصور کی تجویز سے اس نے اتفاق کیا۔ نیچے وادی میں انھیں کچھ کھنڈر دکھائی دیے۔ دونوں نے وہیں رات گزارنے کا قصد کیا اور زمین پر اتر آئے۔

یہ کھنڈر کسی زمانے میں قلعہ رہا ہوگا۔ لمبے لمبے ستون ، خوبصورت محرابیں ، اِکّا دُکّا چھتیں ابھی باقی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی زمانے میں یہ جگہ بہت شاندار رہی ہوگی ——— دونوں ایک راہداری سے گزرتے ہوئے ایک موڑ پر پہنچے اور اچانک منصور کے پانو جم سے گئے۔

" حضور والا ——— !" منصور نے سرگوشی کے انداز میں کہا ——— " ہوسکتا ہے آپ اسے بے وقوفی کی بات سمجھیں، مگر ابھی ابھی میں نے ایک عجیب سی آواز سنی ہے۔ جیسے کوئی کراہ رہا ہو۔ مجھے بھوتوں سے بہت ڈر لگتا ہے ———"

خلیفہ بھی ٹھہر گیا اور اس نے بھی کان لگائے تو ویسی

ہی آواز سنائی دی۔ یہ کسی جانور کی بجائے کسی انسان کی آواز محسوس ہوتی تھی۔ حقیقت جاننے کے لیے خلیفہ آواز کی سمت میں تیزی سے بڑھا لیکن منصور نے فوراً اس کے پر مضبوطی سے پکڑ لیے اور درخواست کی کہ یوں بلا جانے بوجھے وہ جان خطرے میں نہ ڈالے۔ خلیفہ نے سنی ان سنی کر دی۔ اس نے جھٹک کر اپنے پر منصور کی چونچ سے چھڑائے اور اسی اندھیری سمت میں چل پڑا۔ آگے اسے ایک دروازہ دکھائی دیا جو پورا کھلا ہوا تھا۔ دروازے کے پیچھے سے وہ آوازیں آ رہی تھیں۔ خلیفہ اپنی چونچ دروازے کے ایک پٹ سے لگائے چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ دروازے کے پیچھے ایک کمرہ سا تھا۔ ایک دیوار میں کھڑکی تھی جس سے کچھ روشنی اندر آ رہی تھی۔ خلیفہ نے جھانک کر دیکھا تو فرش پر ایک بڑا سا اُلّو نظر آیا۔ اُلّو کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ وہ اپنی مڑی ہوئی چونچ جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

جیسے ہی اُلّو کی نظر خلیفہ اور منصور پر پڑی اس نے پر پھڑپھڑائے اور خوشی سے چلانے لگا۔ ایک ڈینے کو اٹھا کر اس نے پر سے اپنے آنسو پونچھے اور بہت صاف ستھری عربی زبان میں دونوں کو مخاطب کیا۔

"آؤ دوستو! خوش آمدید۔ تمھیں دیکھ کر میں کتنی خوش ہوں! تمھارا آنا میرے لیے مبارک ہوگا۔ میرے بارے میں یہ پیشین گوئی کی جاچکی ہے کہ ایک روز دو سارس میرے پاس آئیں گے اور ان کے آنے سے میری تقدیر سنور جائے گی۔"

خلیفہ اور وزیر سکتے میں آگئے۔ چند لمحوں بعد خلیفہ نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے دونوں پانو جوڑے اور گردن آگے کو بڑھاتے ہوئے کہا:

"آلّو صاحبہ! آپ کی باتوں سے ایسا لگتا ہے کہ آپ کسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ افسوس! ہم خود ایسے حال میں ہیں کہ شاید ہی آپ کی مدد کر سکیں۔ ہم آپ کو اپنی آپ بیتی سنائیں گے۔ اس سے اندازہ کیجیے گا کہ ہم پر بھی کیسی تباہی آئی ہے۔"

آلّو نے ان کی کہانی کے لیے اشتیاق ظاہر کیا اور خلیفہ نے سارا قصّہ کہہ سنایا۔ وہ چپ ہوا تو اُلّو بیگم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی روداد شروع کر دی۔

"اب سنو! میری کہانی سنو! میں بھی تمھاری ہی طرح بدنصیب ہوں۔ میرے باپ ہندستان کے ایک راجا ہیں۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ میرا نام لوسا ہے وہی جادوگر کشنو جس نے تمھیں دھوکا دیا، اسی نے مجھے بھی اس حال کو پہنچایا ہے۔ ایک روز میرے باپ کے پاس آیا اور بولا کہ وہ اپنے بیٹے مرزا کی شادی مجھ سے کرنا چاہتا ہے۔ میرے باپ نے دھکّے دے کر اسے محل سے باہر نکلوا دیا۔

پھر وہ بھیس بدل کر ایک دن آیا۔ میں اس وقت محل کے باغ میں تھی۔ مجھے بھوک لگی۔ میں نے کھانے کے لیے کچھ لانے کا حکم دیا۔ کشنو جادوگر نے غلام کا بھیس بدل رکھا تھا۔ وہ میرے لیے شربت بھی لے آیا۔ اور پھر اس شربت کو پیتے ہی اچانک

میں اس حال کو پہنچ گئی۔ مجھے اتنا گہرا صدمہ پہنچا کہ میں بے ہوش ہو گئی۔ کشنو نے مجھے دبوچ کر اپنے گھر کی راہ لی۔ اپنے گھر پہنچتے ہی اس نے کرخت دار آواز میں کہا ——— "اب تم اسی طرح بدصورت بنی ہوئی یہاں پڑی رہو گی۔ کوئی جانور بھی تمھیں مُنہ نہ لگائے گا۔ اس حال میں تم سے اب کون شادی کرے گا۔ تم اسی طرح پڑے پڑے مر جاؤ گی۔ میں نے تم سے اور تمھارے مغرور باپ سے اپنی توہین کا بدلہ لیا ہے۔"

"جب سے اب تک کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ میں اداس اور اکیلی اس ویرانے میں پڑی ہوئی ہوں۔ دن بھر مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ بس رات کو جب چاندنی پھیلتی ہے مجھے اردگرد کی دنیا نظر آجاتی ہے۔"

اتنا کہہ کر اُلّو بیگم نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور پھر زور زور سے رونے لگی۔

خلیفہ کو اس پر بڑا ترس آیا۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ "ہماری اور تمھاری بدنصیبی میں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معمے کو حل کیسے کیا جائے ———؟"

اُلّو بیگم نے جواب دیا ——— "جی ہاں! مجھے یاد ہے، میرے بچپن میں ایک بوڑھی عورت نے یہ پیشین گوئی کی

تھی کہ ایک سارس کبھی نہ کبھی مجھے بدنصیبی کے جال سے نکالے گا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ گھڑی آگئی ہے۔ ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے!"

"کیا ــــــ؟" خلیفہ نے پوچھا۔

"کشنو جادوگر مہینے میں بس ایک بار یہاں آتا ہے۔ اس کھنڈر میں ایک بہت بڑا سا ہال ہے۔ کشنو جادوگر اسی ہال میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ کیا پتا کسی دن کشنو یا اس کا کوئی ساتھی وہ لفظ زبان پر لے آئے جسے آپ بھول چکے ہیں!"

خلیفہ کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور چونچ اٹھا کر بیقراری سے اس نے کہا ــــــ "پیاری راج کماری! مجھے جلدی بتاؤ وہ اب کب آئیں گے!"

اُلّو بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا ــــــ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دھیرے سے بولی ــــــ "آپ برا نہ مانیں تو یہ کہوں کہ میری ایک شرط ہے۔ اگر آپ وہ شرط مان لیں تو بتا دوں گی!"

"کہو کہو ــــــ! مجھے منظور ہے ــــــ!" خلیفہ نے جلدی سے کہا۔

"میں اپنی حالت سے اسی صورت میں نکل سکتی ہوں

جب آپ دونوں میں سے کوئی مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے ——— !"

یہ سن کر خلیفہ اور وزیر دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ پھر خلیفہ نے وزیر کو باہر چلنے کا اشارہ کیا ——— دونوں اس کمرے سے باہر نکل گئے تو خلیفہ نے کہا ——— "منصو! مجھے یہ احساس ہے کہ میں تم سے ایک نامناسب درخواست کرنے جا رہا ہوں ——— مگر ——— تم اُلّو بیگم سے شادی کرو گے؟"

وزیر نے ذرا اونچی آواز میں کہا ——— "میری بیوی ——— وہ میری آنکھیں نوچ لے گی ——— پھر میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ آپ نوجوان ہیں اور بہتر یہی ہو گا کہ ایک حسین راج کماری سے آپ ہی شادی کر لیں !"

"وہ تو ٹھیک ———" خلیفہ بولا ——— "مگر ——— مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ اُلّو بیگم واقعی حسین اور نوجوان راجکماری ہے ——— مان لو ایسا نہ ہوا تو ——— ؟ میں اندھیرے میں چھلانگ کیسے لگا دوں ———؟"

کچھ دیر تک وہ اسی طرح بحث کرتے رہے۔ دونوں ایک دوسرے کو قائل کرنا چاہتے تھے۔ جب وزیر پر خلیفہ کی بات کا کچھ بھی اثر نہ ہوا تو آخرکار خود خلیفہ نے اُلّو بیگم کی شرط

قبول کر لی۔

اُتو، بیگم کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا ـــــ اس نے کہا۔

"کشنو جادوگر آج ہی رات وہاں آئے گا ـــــ" پھر وہ انھیں اس بڑے ہال کی طرف لے گئی۔ اس نے دونوں کو تاکید کی کہ ذرا سی بھی آواز نہ ہونے پائے ـــــ ایک جگہ چھپ کر انھوں نے ہال کی طرف نظریں جما دیں ـــــ جب اندھیرا اچھا اور گہرا ہوا تو کشنو اور اس کے ساتھی ہال میں داخل ہوئے ـــــ اور ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ انہی میں وہ سوداگر بھی تھا جس سے خلیفہ نے کالا سفوف

لیا تھا۔ جو آدمی سوداگر کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا اُس نے سوداگر سے خلیفہ اور منصور کا قصہ سنانے کی درخواست کی۔ سوداگر نے قصہ چھیڑ دیا۔

"وہ لفظ کیا تھا جسے تین مرتبہ دوہرانے پر وہ دوبارہ انسان بن سکتے تھے؟"

ایک نے پوچھا۔

"معتبر!" سوداگر نے جواب دیا۔

یہ سننا تھا کہ خلیفہ اور منصور خوشی سے اچھل پڑے۔ وہ تیز تیز چلتے ہوئے کھنڈر سے باہر نکل گئے۔ بیچاری اُلّو بیگم کی رفتار بہت سست تھی۔ لیکن کسی طرح لشٹم پشٹم وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے باہر نکلی۔

خلیفہ نے اُلّو بیگم سے کہا ——— "تم نے ہمیں اس مصیبت سے نکلنے کی راہ دکھائی ہے۔ تمھارے اس احسان کے بدلے میں اب میں تم سے شادی کرنے پر تیار ہوں!"

پھر خلیفہ اور وزیر مشرق کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو گئے۔ تین مرتبہ انھوں نے اپنی لمبی گردنیں جھکائیں اور ایک ساتھ چلائے ——— "معتبر ———!" اور پل بھر میں وہ سارس سے دوبارہ انسان بن گئے ——— خلیفہ اور منصور

نے ایک دوسرے کو خوشی خوشی گلے لگایا۔ دونوں ہنس بھی رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بھی رواں تھے۔ پھر جیسے ہی وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے انھیں اپنے قریب ہی ایک بہت
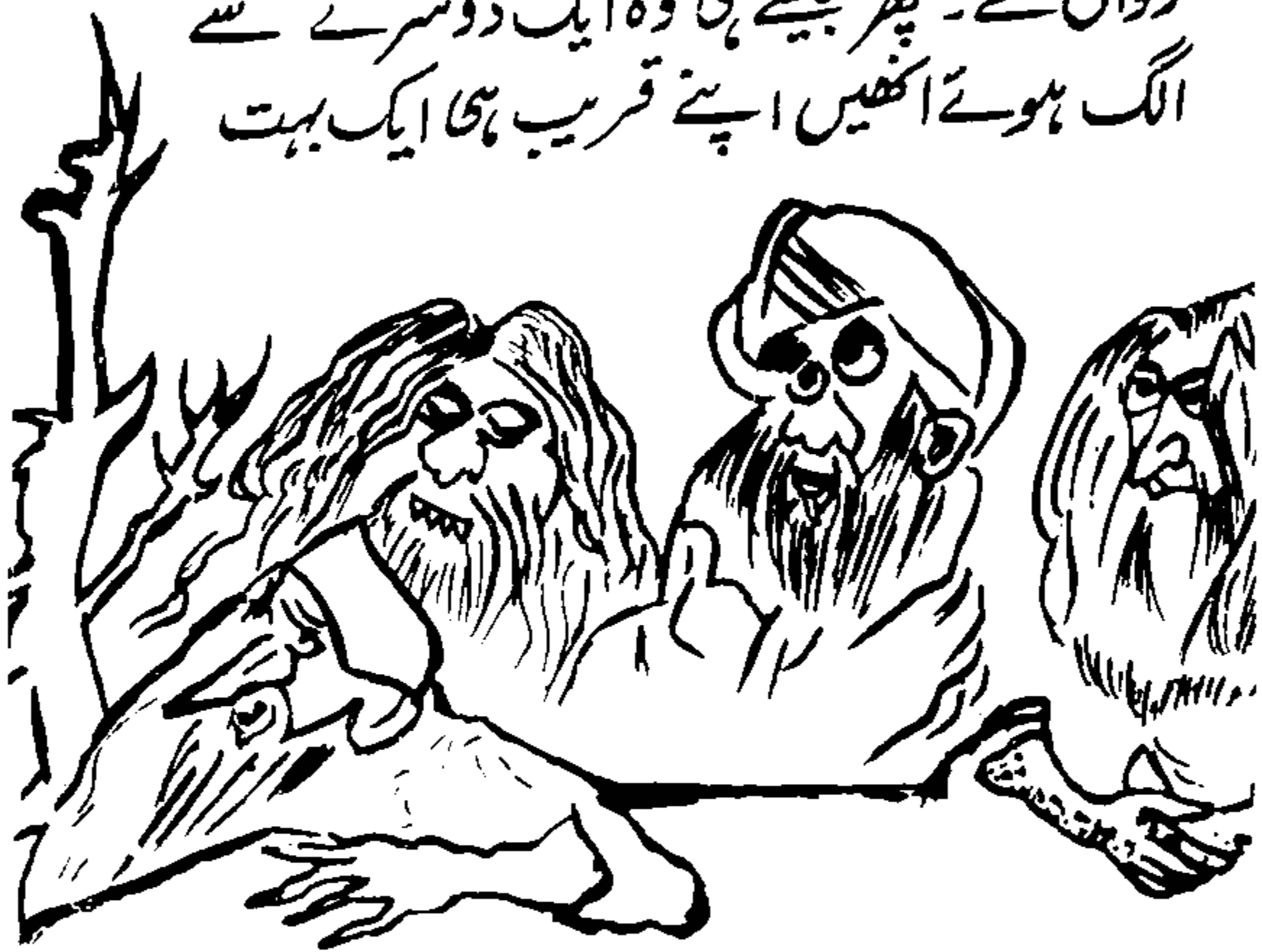
حسین راجکماری دکھائی دی ــــ اس نے زرق برق لباس پہن رکھا تھا اور شرما شرما کر مسکرائے جارہی تھی ــــ آگے بڑھ کر اس نے خلیفہ کا ہاتھ تھام لیا۔

خلیفہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے جارہا تھا ــــ راج کماری نے ہنس کر کہا ــــ "آپ شاید الو

بیگم کو بھول گئے ـــــــ!"

پھر خلیفہ اور راجکماری ایک ساتھ ہنس پڑے۔
خلیفہ نے کہا ـــــــ "میں کتنا خوش قسمت ہوں۔ نہ سارس بنتا نہ اس طرح تم سے ملاقات ہوتی!"

کچھ دیر بعد وہ تینوں بغداد کی طرف چل پڑے۔ خلیفہ کو اپنی جیب میں اس کالے سفوف کے ساتھ اپنا بٹوا بھی مل گیا جس میں اشرفیاں بھری ہوئی تھیں۔ قریب کے گاؤں سے انھوں نے ضرورت کی تمام چیزیں خریدیں اور جلد ہی بغداد پہنچ گئے۔ وہاں لوگوں نے اچانک خلیفہ اور وزیر کو دیکھا تو خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ وہ تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ خلیفہ اور وزیر کہیں مر کھپ گئے۔ اپنے پیارے حکمراں کو انھوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ پھر لوگوں کا ہجوم محل میں جا گھسا۔ کشنو جادوگر اور اس کے بیٹے مرزا کو پکڑ کر لوگ خلیفہ کے سامنے لے آئے۔ کشنو جادوگر کو اسی کھنڈر میں لے جاکر پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بیٹے مرزا کو خلیفہ نے حکم دیا کہ وہ یا تو موت کی سزا قبول کرے یا پھر وہی کالا سفوف سونگھ کر سارس بن جائے۔ مرزا نے مرنے کے بجائے سارس بننا قبول

کیا۔ پھر اس کے سارس بنتے ہی خلیفہ نے اسے ایک پنجرے میں قید کر کے محل کے باغ میں رکھوا دیا۔

راجکماری سے شادی کرنے کے بعد خلیفہ نے بہت، بہت برسوں تک چین سے حکومت کی۔ کبھی کبھی وہ اپنے اس تجربے کو یاد کرتے اور خوب ہنستے۔ ان کے بچے جب یہ قصہ سنتے تو حیران بھی ہوتے اور انھیں ہنسی بھی آتی۔

سلیم کی یہ کہانی سب نے پسند کی۔

ان میں سے ایک نے کہا —— "وقت بہتے پانی کی طرح گزرتا جاتا ہے —— چلو! اب ہم آگے کا سفر شروع کریں۔"

خیمے لپیٹے گئے اور آگے کا سفر پھر سے شروع ہو گیا۔

رات بھر وہ ٹھنڈی ہواؤں میں چلتے رہے —— چلتے رہے —— پھر صبح ہوئی —— سورج نکلا —— دھیرے دھیرے دھوپ پھیلنے لگی۔ جب وہ چلتے چلتے تھک گئے تو ایک جگہ قیام کی ٹھانی —— سوداگروں نے اجنبی سوار کو محبت سے اپنا مہمان بنائے رکھا۔ ایک نے اسے تکیہ دیا۔ دوسرے نے بستر اور چند غلام اس کی خدمت پر مامور کر دیے گئے۔ پھر

جب وہ کھانا کھا کر فارغ ہوئے اور ساتھ بیٹھے تو سب سے کم عمر سوداگر نے سب سے بوڑھے سوداگر سے کہا ـــــ "سلیم کی کہانی نے وقت اچھا گزار دیا ـــــ آج تم کوئی کہانی سناؤ ـــــ احمد ـــــ!"

احمد نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک طویل سانس لی اور یوں گویا ہوا:

"دوستو ـــــ! میں اپنی ہی زندگی کا ایک واقعہ سناؤں گا ـــــ میں نے یہ واقعہ آج تک کسی کو نہیں سنایا۔ مگر تم سب پر مجھے پورا بھروسا ہے اس لیے سنو ـــــ! یہ قصہ بھوتوں کے جہاز کا ہے ـــــ"

بھوتوں کا جہاز

احمد نے اپنا قصّہ اس طرح شروع کیا:
میرے والد ایک معمولی تاجر تھے۔ بلزورا کے مقام پر ان کی چھوٹی سی دکان تھی۔ وہ نہ تو بہت مالدار تھے، نہ ہی بہت خستہ حال۔ ان کو ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ جو کچھ بھی ان کے پاس ہے کہیں ڈوب نہ جائے اس لیے تجارت کے معاملے میں بہت محتاط تھے اور پھونک پھونک کر قدم

رکھتے تھے میری پرورش انھوں نے بہت سادگی مگر توجہ کے ساتھ کی جلد ہی میں اس لائق ہوگیا کہ کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ جب میں اٹھارہ برس کی عمر کو پہنچا تو میرے والد نے کاروبار کو پھیلانے کی کوشش کی۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد اچانک وہ چل بسے۔ شاید انھیں یہ احساس ہر دم ستاتا رہتا تھا کہ سمندری تجارت میں انھوں نے ایک بڑی رقم لگادی ہے اور انھیں یہ ڈر تھا کہ ساری رقم کہیں غارت نہ ہو جائے۔ نفع کی جگہ نقصان نہ اٹھانا پڑے۔

بہرحال، جلد ہی مجھ پر یہ بات کھلی کہ ان کی موت میرے لیے مبارک ثابت ہوئی ہے۔ چند ہفتوں بعد ہی وہ جہاز جس پر اُن کا سامان لدا ہوا تھا غرقاب ہوگیا۔ اس تباہی سے میرے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ بچا کھچا سامان میں نے اونے پونے بیچ دیا اور قسمت آزمائی کے لیے پردیس جانے کی ٹھانی۔ میرے ساتھ صرف ایک شخص تھا، میرے والد کا ایک پرانا خادم۔ اُسے ہر دم میری فکر لگی رہتی تھی اس لیے اس نے میری بدحالی کے باوجود میرا ساتھ نہ چھوڑا۔

ہم ایک جہاز پر سوار ہوئے۔ اس کا رخ ہندستان کی طرف تھا۔ ہوا سازگار تھی۔ سفر خوشگوار —— پھر اچانک پندرہ روز بعد جہاز کے کپتان نے خبر دی کہ سمندر میں طوفان آنے والا ہے۔ ڈر سے اس کی آواز کانپ رہی تھی اور چہرہ تاریک ہوگیا تھا۔ اس راستے پر یہ اس کا

پہلا سفر تھا۔ سوا سے کچھ بھی اندازہ اس بات کا نہ تھا کہ طوفان کیا موڑ اختیار کرے گا اور اس سے بچنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اس نے بادبان سمیٹ لیے۔ جہاز اِدھر اُدھر ڈولتا آگے بڑھتا رہا۔ رات آئی۔ بہت ٹھنڈی اور اندھیری۔ تب کپتان کو ہوش آیا کہ اُس نے غلطی کی ہے۔

یکایک اندھیرے سے ایک اور جہاز نمودار ہوا اور ہمارے جہاز کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ اُس جہاز کے عرشے سے عجیب انوکھی اور ڈراونی آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ کبھی ان آوازوں پر شور کا گمان ہوتا، کبھی قہقہوں کا۔ طوفان میں بھی شدّت پیدا ہو گئی تھی۔ ہمارے حواس گم ہو گئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ کپتان میرے قریب ہی چپ چاپ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ڈر جھانک رہا تھا اور چہرے کی رنگت ایک دم پیلی پڑ گئی تھی۔

"ہم اب ڈوب جائیں گے!" اس نے درد بھری آواز میں کہا ـــــ "یہاں چاروں طرف موت منڈلا رہی ہے ـــــ"

اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ اور پوچھتا، ہمارے جہاز کا سارا عملہ ہمارے قریب آ کھڑا ہوا اور سب کے سب سسکنے لگے۔

"یہ موت کا جہاز ہے!" ایک ساتھ انھوں نے کہا: "ہماری بدنصیبی ہمیں یہاں کھینچ لائی ہے ـــــ"

ہوا کا شور اور تیز ہو گیا۔ سمندر کی سطح پہلے سے بھی زیادہ

بیقرار ہوگئی اور طوفانی لہریں خوب اونچی اونچی اٹھنے لگیں۔ ہمارا جہاز کسی مرجھائے ہوئے پتے کی طرح ادھر اُدھر ڈولنے لگا۔ کپتان نے قرآن شریف کی ایک جلد نکالی اور اپنے ایک ساتھی سے درخواست کی کہ وہ تلاوت شروع کرے۔ لیکن اس وقت اللہ نے بھی ہماری دعا قبول نہ کی۔ مشکل سے ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ہمارا جہاز ایک چٹان سے ٹکرایا۔ جلدی جلدی حفاظتی کشتیاں نکالی گئیں اور ہم سب ان پر بیٹھے ہی تھے کہ ہمارا جہاز سمندر کی گہری تہہ میں اتر گیا۔

دنیا ہماری نظروں میں تاریک ہوگئی۔ لیکن ابھی تو اور بھی مصیبتیں آنی تھیں۔ طوفان کا قہر اسی طرح جاری رہا اور ہمارے لیے کشتیوں کو قابو میں رکھنا بھی دشوار ہوگیا۔ میں نے اپنے بوڑھے خادم کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا اور ہم ایک ساتھ دعا کرنے لگے کہ پروردگار ہمیں اس عذاب سے نجات دے۔ پتا نہیں کب تک ہم اسی طرح لہروں کے تھپیڑے کھاتے رہے۔ آخرکار آسمان پر صبح کی سفیدی پھیلنے لگی۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن اب ایک نئی مصیبت سر پر کھڑی تھی۔ اچانک ہماری کشتی الٹ گئی۔ جہاز کے دوسرے ساتھیوں کو پھر میں نے نہیں دیکھا۔

میں بے ہوش ہوگیا تھا۔ دوبارہ ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے وفادار خادم نے مجھے سینے سے لگا رکھا ہے اور ہم ایک کشتی پر سوار
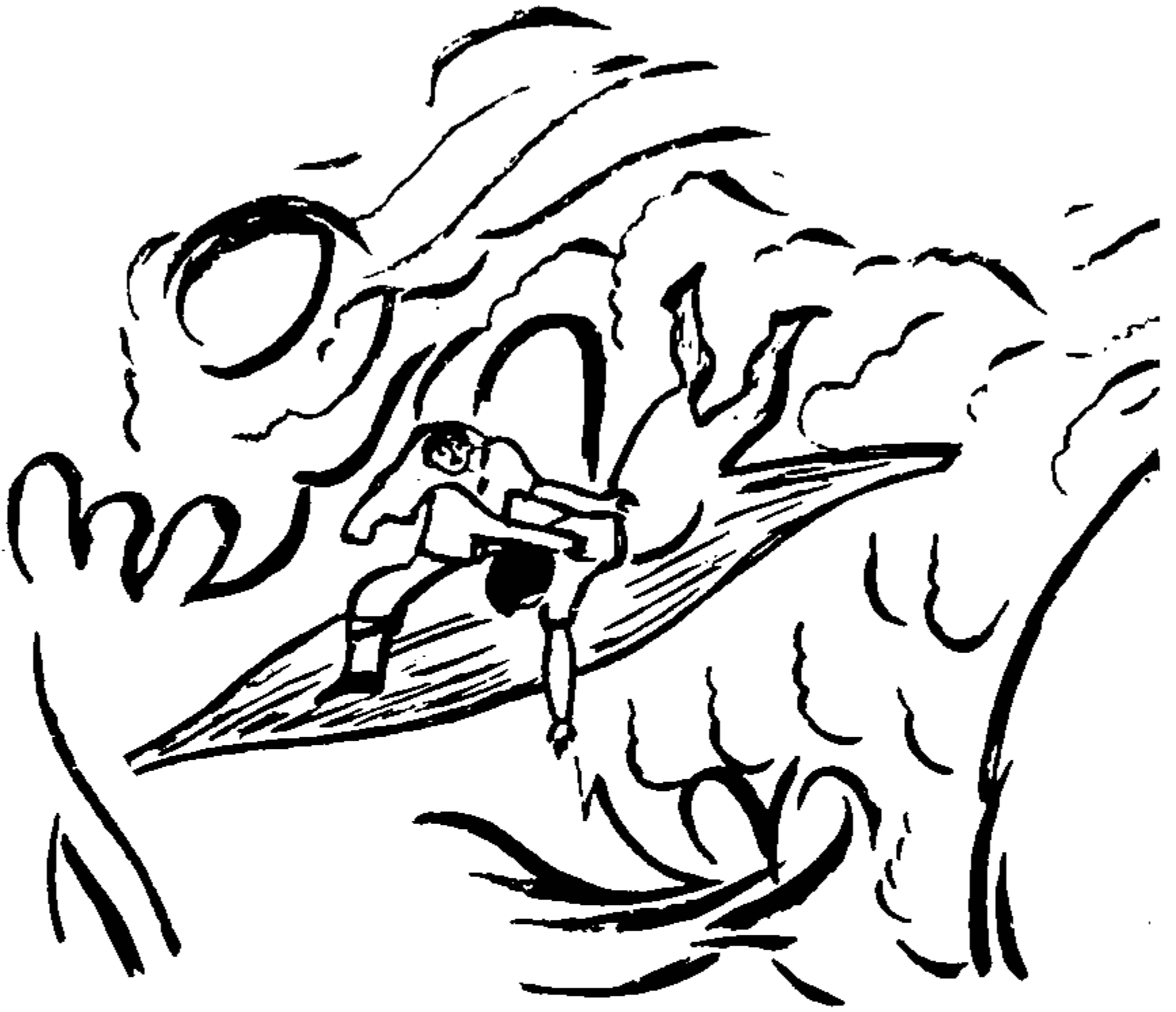
ہیں۔ خادم نے خدا جانے کن جتنوں سے ایک کشتی ڈوبنے سے پہلے پکڑ لی
تھی پھر اپنے ساتھ مجھے بھی اس پر چڑھانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اب
ہوا ساکت تھی اور سمندر خاموش پر دور دور کہیں طوفان کا نام و نشان
نہ تھا۔ ہمارے جہاز کے آثار کہیں نظر نہ آتے تھے لیکن اچانک ایک
اور جہاز ہمیں دکھائی دیا۔ اس جہاز کا فاصلہ ہم سے بہت زیادہ نہیں
تھا اور دھیرے دھیرے وہ ہماری طرف آرہا تھا۔ جب جہاز اور

قریب آگیا تو مجھے دھیان آیا کہ یہ تو وہی جہاز ہے جس نے پچھلی رات ہمارے اوسان گم کر دیے تھے۔ ڈر کی ایک لہر سر سے پیر تک دوڑ گئی۔ مجھ پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔ اس ویران جہاز کو دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس پر کوئی آدم تھا نہ آدم زاد۔ اور جہاز چپ چاپ ہماری طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کیا پتا، خدا نے ہماری مدد کے لیے ہی یہ جہاز بھیجا ہو! میں اسی خیال سے چلّانے لگا کہ شاید اس جہاز میں اندر کوئی چھپا بیٹھا ہو۔

جہاز کے عرشے سے ایک لمبی رسّی لٹک رہی تھی۔ اپنے ہاتھوں کو چپّو کی طرح چلاتے ہوئے ہم کشتی اس رسّی تک لے گئے اور اسے پکڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ میں نے ایک بار پھر پوری قوت سے ایک آواز بلند کی مگر اس جہاز میں زندگی کا کوئی بھی نشان نہ تھا۔ بہرحال، اس رسّی کے سہارے ہم کسی نہ کسی طرح جہاز پر پہنچ گئے۔

اور پھر!

اف! جہاز پر قدم رکھتے ہی ہم نے ایک ایسا بھیانک منظر دیکھا کہ اس کے تصوّر سے بھی سر چکرانے لگتا ہے۔ جہاز پر ہر طرف خون کے دھبّے تھے اور کوئی پچیس تیس لاشیں، سب کے سب ترکی لباسوں میں ملبوس۔ سب سے بڑے بادبان کے پاس

قیمتی چمک دار کپڑے پہنے ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ اس کا چہرہ بالکل زرد تھا اور اس کے ماتھے پر ایک لمبی کیل جڑی ہوئی تھی۔ اس کیل نے بادبان کے ستون سے اسے جکڑ دیا تھا۔ وہ بھی بے جان تھا۔ میرے پاؤں پتھر جیسے ہو گئے اور سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ میرے ساتھی نے بھی جب یہ منظر دیکھا تو حیرت اور خوف کے سبب ٹھٹھک کر رہ گیا۔ بڑی مشکلوں سے ہم نے اپنے حواس درست کیے، حوصلے سمیٹے اور اللہ کا نام لے کر آگے بڑھے۔ ہر قدم پر ہمیں یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ ابھی پھر کوئی انہونی واردات نہ ہو جائے۔ ہمارے چاروں طرف حدِ نظر تک پانی ہی پانی تھا اور اس ویرانے میں شاید بس ہم دو ہی انسان تھے۔ ہم اس خیال سے اپنی آواز اونچی نہیں ہونے دیتے تھے کہ کہیں اس جہاز کا مردہ کپتان اچانک زندہ نہ ہو جائے یا فرش پر بکھری ہوئی لاشوں میں سے کوئی حرکت نہ کرنے لگے۔ آخر کار ہم گرتے پڑتے اُن سیڑھیوں پر پہنچے جو جہاز کے کیبن کی طرف جاتی تھیں۔ پھر ہم اچانک رک گئے۔ خاموشی سے ایک دوسرے پر نگاہ کی۔ دل کی بات زبان پر لانے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔

پھر میرا بوڑھا خادم یوں گویا ہوا:

"حضور ـــــــ یہاں کوئی بھیانک واردات ہوئی ہے
ہر طرف لاشیں، لاشیں، ان کے درمیان زندہ رہنے سے تو بہتر ہے
کہ ہم آگے بڑھیں۔ ہو سکتا ہے نیچے کہیں قاتل چھپے بیٹھے ہوں۔
پھر بھی بھلا کب تک ہم ان لاشوں کے ساتھ وقت گزار سکتے ہیں؟"

اُس نے میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔ خود میں یہی سوچ
رہا تھا۔ ہم نے ہمّت سے کام لینے کی ٹھانی اور نیچے چلے گئے۔ یہاں
بھی چاروں طرف قبرستان کا سناٹا طاری تھا۔ بس ہمارے قدموں کی

چاپ سنائی دیتی تھی۔ راہداری میں بہت دھیمی روشنی تھی ہم ایک دروازے
کے سامنے رک گئے۔ کواڑ سے میں نے اپنے کان لگائے کہ کچھ سن سکوں۔
وہاں بھی خاموشی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور ایک بڑے سے
کیبن میں قدم رکھا۔ وہاں عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ سارے
فرش پر کپڑے، ظروف، اسلحے اور دوسری بہت سی چیزیں بکھری
پڑی تھیں۔ ایک بھی ایسی چیز نہ تھی جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے
کہ اپنی صحیح جگہ پر رکھی ہوئی ہے۔ کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہاں کسی
زبردست ضیافت کا اہتمام کیا گیا ہوگا۔ ہم یکے بعد دیگرے تمام
کیبنوں کا معائنہ کرتے پھرے اور ہماری آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔
قسم قسم کے قیمتی سامان، زر و جواہر، ملبوسات، ایک سے ایک

نادرہ کار چیزوں سے تمام کمرے اٹے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر کچھ ڈھارس بندھی۔ دل نے کہا کہ وہاں اب کوئی ذی روح نظر نہیں آتا تو پھر اس کے مالک بس ہم ہی ٹھہرے۔ کیا زبردست خزانہ ہاتھ لگا ہے! ـــــ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے خادم ابراہیم نے دبی زبان سے کہا ـــــ "ہم زمین سے بہت دور ہیں، اس لیے کیا مال واسباب، کیا زروجواہر سب بیکار ہیں۔ کوئی صورت ایسی دکھائی نہیں دیتی کہ ہم بحفاظت زمین تک پہنچ جائیں!"

ان کمروں میں کھانا بھی وافر تھا۔ طرح طرح کے لذیذ پکوان اور عمدہ عمدہ مشروبات۔ ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا اور شکر اس خدا کا ادا کیا جو اپنے بندوں کو ہر حال میں رزق دیتا ہے۔ پھر ہم دوبارہ عرشے کی طرف گئے اور ایک بار پھر ان لاشوں کو دیکھتے ہی ہمارے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی۔ ہم نے یہ طے کیا کہ ایک ایک کر کے تمام لاشوں کو سمندر میں پھینک دیں اور اس منظر سے چھٹکارا پائیں ـــــ لیکن۔ لیکن ـــــ ہم انھیں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی کھسکا نہ سکے۔ لگتا تھا کہ وہ فرش سے چپک گئی ہیں۔ انھیں اٹھانے کے لیے ہمیں تختوں کو چیرنا پڑتا۔ مگر ہمارے پاس اوزار بھی نہیں تھے۔
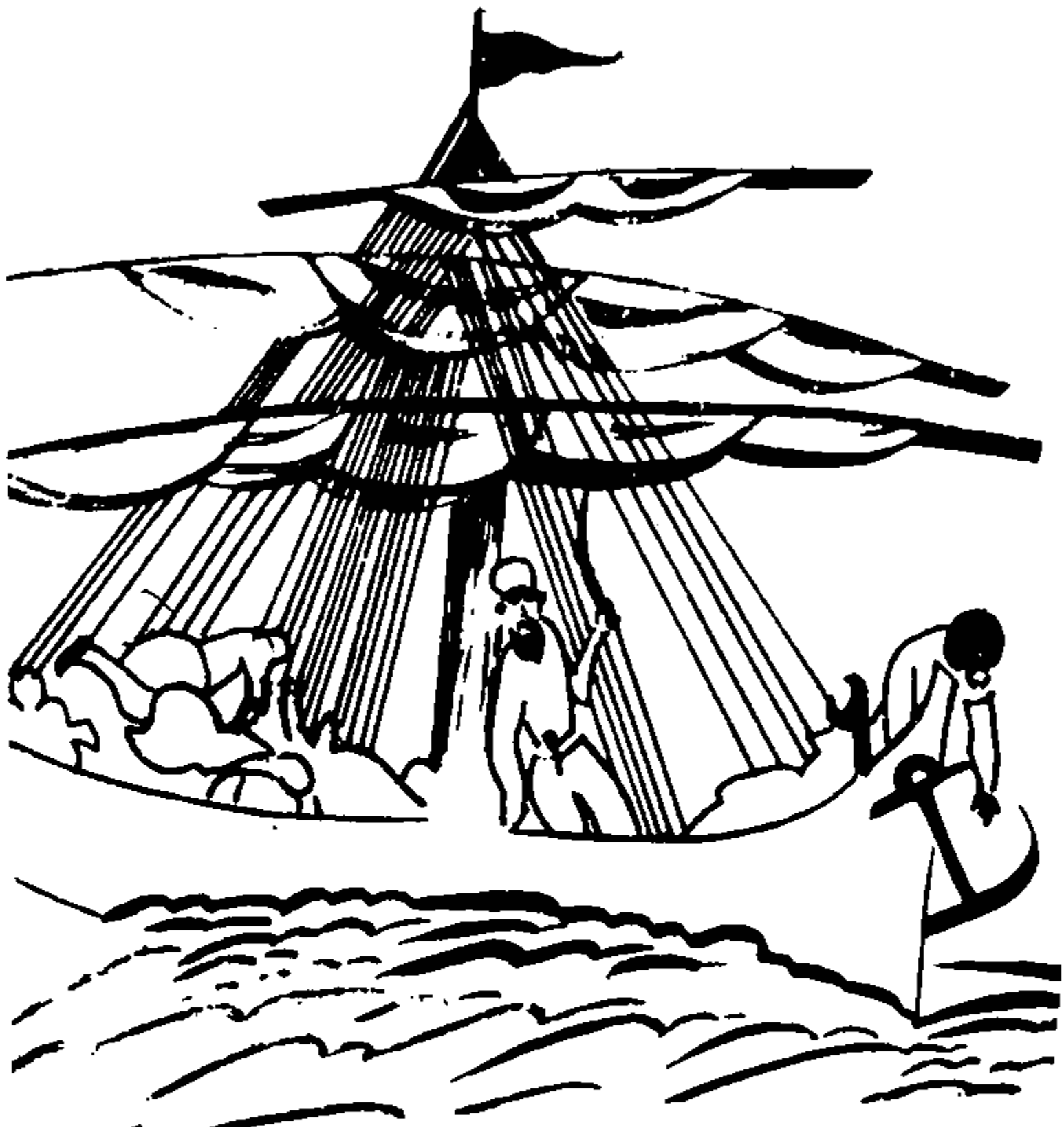
ذرا خیال کرو عزیزو! ہم نے جب جہاز کے کپتان کے ہاتھ سے تلوار نکالنی چاہی تو محسوس ہوا کہ اس کی بیجان انگلیوں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی ہے۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

جوں توں کر کے دن گزرا۔ شام تک ہم کھانت کھانت وسوسوں میں گھرے رہے۔ رات آئی تو میں نے ابراہیم سے کہا

کر اب پڑ کر سو رہے۔ میں ابھی کچھ اور دیر عرشے پر ٹھہرنا چاہتا تھا اور اس فکر میں تھا کہ اس عذاب سے چھٹکارے کی کوئی ترکیب ذہن میں آئے۔ اسی عالم میں دو گھنٹے گزر گئے۔ پھر چاند نکلا اور ہر طرف دودھیا روشنی پھیل گئی۔ پھر مجھے نیند سی آنے لگی۔ میں نے لاکھ چاہا کہ نیند کے غلبے سے بچوں لیکن تھکن سے بُرا حال تھا۔ عرشے پر ایک کونے میں لیٹ کر میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اسے نیند کے بجائے غنودگی ہی کہنا چاہیے کیونکہ میں آنکھیں بند کیے کیے لہروں کے تھپیڑے اور ہوا کے جھونکوں کا شور سن رہا تھا۔ پھر اچانک ——— مجھے قریب ہی بھاری قدموں کی گونج سنائی دی اور ایک ساتھ بہت سی ملی جلی آوازیں کانوں سے ٹکرائیں۔ میں نے اٹھنا چاہا لیکن گھٹنے مفلوج ہو کر رہ گئے تھے اور میں کوشش کے باوجود اپنی آنکھیں کھول نہیں پا رہا تھا۔ آوازیں اب اور صاف ہوتی گئیں اور یوں محسوس ہوا جیسے بہت سارے لوگ نشے میں اِدھر اُدھر لڑکھڑا رہے ہیں۔ کبھی کبھی اس قسم کے احکامات بھی سنائی دیتے کہ بادبان کھول دیے جائیں یا رسیاں اور کس دی جائیں۔ دھیرے دھیرے میرے حواس جواب دیتے گئے۔ میں گہری نیند میں ڈوب گیا اور کہیں دور سے جنگی اسلحوں کے ٹکرانے کی آواز آنے لگی۔

آنکھ کھلی تو کافی وقت گزر چکا تھا۔ سورج سر پر تھا اور

اس کی تیز کرنیں میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ میں نے حیران آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ رات کی ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آئیں۔ طوفان جہاز، عجیب انوکھی آوازیں، سب خواب سی محسوس ہونے لگیں۔ ——— لیکن جب میں جمائی لیتا ہوا اٹھا تو کیا دیکھا کہ سب کچھ پچھلی شام جیسا ہے۔ عرشے پر اُسی طرح لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ جہاز کا کپتان پہلے ہی کی طرح ہاتھ میں ننگی تلوار لیے جہاز کے مستول سے چپکا ہوا تھا۔ رات کے ڈراؤنے خوابوں کا خیال آتے ہی میرے خشک ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ وہ کمرے میں بیٹھا ہوا تھا، اداس اور خیالوں میں گم۔

"میرے آقا ——— !" ابراہیم نے مجھے دیکھتے ہوئے آواز دی۔ "میں اس جہاز پر ایک اور رات گزارنے کے بجائے سمندر کی تہہ میں ڈوب جانا بہتر سمجھتا ہوں۔"

میں نے دھیمی آواز میں کہا ——— "کیوں ——— ؟ کیا بات ہے ——— ؟"

ابراہیم نے جواب دیا ——— "میں چند گھنٹوں کے لیے سویا تھا۔ پھر اپنے قریب ہی عرشے پر بھاگتے ہوئے قدموں کی گونج نے

مجھے جگا دیا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ آپ ہوں گے۔ لیکن پھر ——
پھر یہ خیال آیا کہ اتنا شور ایک اکیلے آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔
آخر کار، بھاری قدموں سے میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترا۔
اور —— اس کے بعد —— مجھے کچھ بھی یاد نہیں سوائے اُس لمحے کے جب
مجھے ہوش آیا تھا۔ ہوش آنے پر میں نے کیا دیکھا کہ وہ آدمی جو جہاز کے
مستول سے چپکا کھڑا ہے، جس کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہے اور جس کی
پیشانی پر کیل ٹھنکی ہوئی ہے —— ایک میز کے قریب بیٹھا شراب
پی رہا ہے اور گا رہا ہے۔ اس کے پاس ہی ایک اور شخص بیٹھا ہوا
ہے اور وہ بھی پینے میں مصروف ہے ——"

یہ سب سنتے ہوئے میں نے سوچا کہ جس بات کو میں خواب
سمجھ رہا ہوں وہ خواب نہیں۔ میں نے سچ مچ لاشوں کو ہنستے بولتے،
پیتے پلاتے دیکھا تھا۔ اب ایسی پراسرار مخلوق کے ساتھ آگے کا سفر کیا
کچھ تباہی نہ لائے گا —— ! اس سے نجات کی شاید کوئی صورت
نہیں —— میں نے جب مایوسی کی باتیں شروع کیں تو ابراہیم
نے ایک لمحے کے لیے غور سے میری طرف دیکھا، آہ بھری اور بولا۔
"ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے !"

"کیا ؟ کیا ؟ جلدی بتاؤ !" میں نے بے قراری سے کہا۔
اُس نے بتایا کہ اس کے مرحوم دادا نے جو بہت تجربہ کار جہاں دیدہ

شخص تھا اور جس نے دور اجنبی ملکوں کے لمبے لمبے سفر کیے تھے اور جو بہت سی بد روحوں کو اپنے قابو میں رکھتا تھا ۔۔۔۔۔۔۔ اس نے ابراہیم کو ایک بار ایک منتر سکھایا تھا۔ اس منتر کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم رات بھر جاگتے رہیں۔ پل بھر کے لیے بھی پلک جھپکنے نہ پائے اور جاگتے رہنے کی ترکیب یہ ہے کہ جس وقت بھی آنکھیں کڑوی ہونے لگیں قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی جائے۔

میں نے بوڑھے خادم کی رائے سے اتفاق کیا۔ ہم اس کمرے سے ملی ہوئی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں چلے گئے۔ دروازے میں کئی عدد بڑے بڑے سوراخ کر لیے کہ ان سے آنکھیں لگا کر اندر کا سارا حال دیکھ سکیں۔ تب ہم نے اپنی کوٹھری کے کواڑ بند کیے۔ فرش کے چاروں کونوں پر اسمائے الٰہی میں سے چار اسم لکھے پھر اتنی تیاریوں کے بعد رات کے آنے والے ہنگاموں کا ہم انتظار کرنے لگے۔

گیارہ بجے کے قریب مجھ پر غنودگی سی چھانے لگی میں نے فوراً قرآن شریف کی کچھ آیتیں دوہرائیں۔ حواس بجا ہوئے، نیند غائب۔ اُلجھنے وسوسوں کا ڈر بھی کچھ کم ہوا۔ پھر اچانک عرشے پر دھمادھم کی آوازیں گونجیں۔ رسیاں چرچرائیں۔ تختے پر بھاری قدموں کی گونج سنائی دی اور ایک ساتھ بہت سی ملی جلی آوازوں کا شور۔ دم سادھے

سراسیمہ اور حیران، چند لمحوں تک ہم یونہی بیٹھے رہے۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ کوئی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا ہے۔ ابراہیم نے اپنے دادا کا سکھایا ہوا منتر پڑھنا شروع کر دیا۔

"تم چاہے اوپر آسمانوں سے آئے ہو
چاہے گہرے پانی کی تہہ سے
تم چاہے زمین سے آئے ہو
چاہے اُس آگ نے تمھیں جنم دیا ہو جو ہمیشہ جلتی رہے گی۔
ہمارے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ
اُس رب کے حضور جو ستاروں سے آگے ہے —"

میں یہ بتا دوں کہ جادو منتر کی باتوں پر میں نے کبھی یقین نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھی دل ابراہیم کے اس منتر کی طاقت پر بھروسے کے لیے آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں چپ چاپ سنتا رہا — سنتا رہا — اور اچانک سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ سر کے سارے بال جڑوں پر تن کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ میرے خدا! سامنے کا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ پھر وہ لمبا تڑنگا، مضبوط جسم والا کپتان جس کی لاش جہاز کے مستول سے چپکی کھڑی تھی، اسی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اس کے ماتھے پر جڑی ہوئی لمبی کیل اب تک اپنی جگہ پر تھی۔ البتہ اس کی تلوار کمر سے بندھی ہوئی تھی اور

اس کا ہاتھ خالی تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص تھا، بہت قیمتی اور زرق برق لباس پہنے ہوئے۔ مجھے یاد آیا کہ اس شخص کو بھی میں نے عرشے پر پڑی ہوئی لاشوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ کپتان کا چہرہ زرد تھا، داڑھی گھنی اور کالی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی کچھ اس انداز سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں کہ میرا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم جس دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے تھے، وہ بالکل اس کے پاس سے گزرا مگر ہم دونوں پر اس کی نظر نہیں پڑی۔ پھر کپتان اور وہ دوسرا شخص کمرے کے بیچوں بیچ پڑی ہوئی میز کے گرد بیٹھ گئے اور زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ لیکن ہم ان کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھے کیونکہ وہ کسی عجیب و غریب زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس گفتگو کے دوران کبھی کبھی ان کی آواز چیخ جیسی سنائی دیتی اور ان کے لہجے میں تیزی آ جاتی۔ لگتا وہ غصے میں ہیں۔ اسی جوش میں کپتان میز پر "مکے" مارنے لگا۔ ماحول کچھ اور ڈراونا ہو گیا۔ دفعتاً وہ دوسرا شخص بالکل وحشیوں کے انداز میں قہقہے لگانے لگا اور اٹھتے ہوئے کپتان کو اپنے ساتھ آنے کا اشارا کیا۔ کپتان اٹھ کھڑا ہوا اور کمر سے تلوار کھینچ لی۔ پھر دونوں کمرے سے نکل گئے۔ ہم نے اطمینان کا ایک سانس لیا۔ ایسا لگا کہ کوئی بہت بڑی بلا سر سے ٹل گئی ہے۔ مگر یہ ہماری خام خیالی تھی۔ ابھی تو اور بھی بہت کچھ ہونا تھا۔ عرشے پر شور و غل پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا۔ ہمیں ایسا

لگا کہ لوگ بھاگ رہے ہیں، دوڑ رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، پاگلوں جیسی آوازیں نکال رہے ہیں اور قہقہے لگا رہے ہیں۔ پھر یہ ہنگامہ اتنا بڑھ گیا، اتنا بڑھ گیا کہ پورا جہاز ڈولنے لگا۔ ہم دم سادھے کھڑے رہے۔ ہمیں ڈر لگ رہا تھا کہ ایک دو پل میں جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائے گا۔ اسلحوں کی جھنکار، چیخ پکار، ڈانٹ ڈپٹ کا شور اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔

کچھ دیر بعد سناٹا چھا گیا، بالکل اچانک۔ جب کافی دیر تک کوئی آواز سنائی نہیں دی تو ہم دروازے کی اوٹ سے باہر نکلے اور ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے۔ پھر ہم سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر پہنچے۔ اب سارا ماحول بدل چکا تھا۔ کپتان کی لاش جہاز کے مستول سے چپکی کھڑی تھی اور عرشے پر اِدھر اُدھر لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔

ہم نے ایک بار پھر کوشش کی کہ لاشوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں۔ اس بار بھی ناکامی ہوئی۔ ابراہیم کا منتر بیکار ثابت ہوا۔ اگلی رات بھی وہی تماشا ہوا اور اس سے اگلی رات بھی وہی شور و غل، ہنگامہ، مار کاٹ، مجنونانہ چیخیں اور دیوانہ وار قہقہے۔ پھر سناٹا۔ سارا ڈراما جوں کا توں دوہرایا جاتا رہا۔

میں اور ابراہیم گھنٹوں اس تباہ حالی پر گفتگو کرتے رہے۔ لیکن اس عذاب سے نکلنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی سوائے اس کے کہ جہاز کو کسی طرح اس جگہ سے کھسکا یا جائے اور ہم سمندر کو پار کرتے ہوئے زمین تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ بظاہر یہ کام دو آدمیوں کے بس کا نہیں تھا۔ مگر سمندری سفر کا ہمیں خاصا تجربہ تھا اس لیے ہم نے سوچا کہ پچھلے تجربوں سے کچھ فائدہ اٹھایا جائے۔ ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ میں نے کچھ اوزار جہاز کے نچلے کیبن میں ڈھونڈ نکالے اور ہزار جتنوں کے بعد جہاز کا رخ مشرق کی سمت موڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمیں امید تھی کہ اس طرح ہم جلد ہی خشکی تک پہنچ جائیں گے۔

سفر کے پہلے دن ہوا نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ جہاز کی رفتار خاصی تیز اور تسلی بخش رہی۔ لیکن رات آتے ہی ہوا کا رُخ ایک دم بدل گیا اور اس کے تھپیڑے ہمارے چہروں سے ٹکرانے لگے۔ اب جہاز کو ہوا کی مخالف سمت میں لے جانا مشکل نہیں ناممکن نظر آتا تھا۔ ہماری ہر کوشش بے کار گئی۔ جہاز اگر چند گز آگے بڑھتا تو کوئی ان دیکھی قوت اسے پل بھر میں کئی گز پیچھے دھکیل دیتی۔ حواس تو گم تھے ہی، اسی عالم میں آنکھیں

بھی بوجھل ہونے لگیں۔ اس حال میں عرشے پر جمے رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ رات کا اندھیرا ذرا اور گہرا ہوتے ہی تمام لاشیں ایک بار پھر حرکت کرنے لگیں گی اور ان کی پرانی جنگ کا سلسلہ پھر شروع ہو جائے گا۔ ناچار ہم نیچے چلے گئے اور اللہ کا نام لے کر دروازے کی اوٹ میں فرش پر پڑ رہے۔ ہم اتنے تھکے

ہوئے تھے کہ اس رات ہمیں گہری نیند آئی۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو پتا چلا کہ ہم جہاں سے چلے تھے ٹھیک اسی مقام پر دوبارہ واپس آ گئے ہیں۔ یہ حقیقت کتنی بھیانک تھی! ہماری ساری محنت اکارت گئی تھی ہمارا دل ڈوبنے لگا، یہ سوچ کر کہ زندگی میں اس عذاب سے چھٹکارا پانا شاید ہمارے مقدر میں نہیں ہے۔ بھوتوں سے بھرے ہوئے اس جہاز پر ہم بھلا کتنے دن گزار سکتے تھے؟ آخر ایک نہ ایک دن کھانے پینے کا سامان ختم ہوتا تھا۔ پھر؟ پھر کیا ہوگا؟ فاقوں کی موت؟ ہم جتنا سوچتے جاتے دل اتنا ہی بیٹھتا جاتا۔ ہم نے سوچا کیوں نہ اپنے آپ کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیں۔ یہ موت اس ڈر کے عذاب سے تو بہتر ہوگی! مگر ابراہیم نے کہا ـــ ایک بار پھر اسی منتر کو آزمایا جائے۔ عزیزو! امید بھلا کب، کس حال میں، انسان کا ساتھ چھوڑتی ہے؟ میں نے حامی بھرلی کہ شاید اس بار خدا ہماری فریاد سن لے۔ ہم نے اس منتر کی کئی نقلیں تیار کیں اور انھیں تعویذ کی شکل دے کر جہاز کے بادبانوں سے لٹکا دیا۔ دن بھر ہوا ساز گار رہی اور ہمارا سفر جاری رہا۔ رات آئی تو پھر بھانت بھانت کے وسوسے پریشان کرنے لگے۔ خدا کا شکر ہے کہ رات کافی دیر تک،

جب تک ہم جاگتے رہے، ہوا کا رخ ہمارا ساتھ دیتا رہا۔ ہم نے شکریہ ادا کیا کہ خدا نے ہماری دعا سن لی تھی۔

اگلے روز نیند اچٹنے پر ہم نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔

یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں جہاز پھر اسی جگہ واپس نہ آگیا ہو۔ ــــ مگر اب کے ایسا نہیں ہوا تھا ــ ابراہیم کا منتر کام کر گیا تھا اور ہم نے کافی راستہ طے کر لیا تھا۔ آگے کے سات دن اور سات راتیں بھی اسی طرح ساتھ خیریت کے گزریں۔ کوئی انہونی بات نہیں ہوئی۔ سفر سلامتی سے جاری رہا اور ہم آگے بڑھتے گئے۔ پھر اے عزیزو! آٹھویں دن کی صبح آئی اور ہمارے لیے مسرت کا پیغام لائی۔ میں اور ابراہیم سربسجود ہو گئے کہ خداوندِ کریم نے ہماری التجا بالآخر قبول کر لی تھی اور اب زمین کا کنارا ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ ہم نے شکرانے کی نماز پڑھی۔ دن بھر اور رات بھر ہم نے ساحل کے ساتھ ساتھ اپنا سفر جاری رکھا اور دوسرے دن ہمیں ایک شہر کے آثار دکھائی دیے۔ برجیاں، محرابیں، مینار، گنبد اور شہر پناہ کے جھروکے سامنے تھے۔ ہم نے ایک چھوٹی سی کشتی نکالی۔ جہاز کے بادبان سمیٹے اور لنگر ڈال دیے۔ پھر اس کشتی پر بیٹھ کر زمین تک پہنچے۔ شہر پناہ کے پھاٹک تک رسائی آدھے گھنٹے میں ہوئی۔ وہاں ایک

راہ گیر نظر آیا۔ اس نے حیرت سے ہم اجنبیوں پر نظر کی۔ ہمیں پردیسی جان کر ہماری مدد کو آیا اور ہمیں بتایا کہ سامنے آبادی ملک ہندستان کے ایک شہر کی ہے۔ ہمارے دل خوشی سے کھل اُٹھے۔ ہم بہ ہزار خرابی وہیں پہنچ گئے تھے جہاں پہنچنا چاہتے تھے۔ راہ گیر سے پتا نشان پوچھ کر ہم نے ایک سرائے کی راہ لی کہ قیام کا انتظام کریں اور سفر کی تکان دور ہو۔ سرائے کا مالک بھی عزت سے پیش آیا۔ ہمارے لیے خوب عمدہ لذیذ کھانا تیار کیا۔ ہم نے ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد حقّے کی گڑگڑی لگائی اور اس سے پوچھا کہ اس آبادی میں کوئی بزرگ ایسا بھی ہے جو کچھ جادو ٹونے کا علم رکھتا ہو؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں ایک بزرگ ایسا اسی بستی میں موجود ہے۔ پھر وہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گیا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم اس کے ساتھ چلے۔ وہ ہمیں ایک تنگ سی گلی میں لے گیا اور ایک معمولی سے مکان کے دروازے پر رک گیا۔ پھر اس نے ہمیں بتایا کہ وہ مرد بزرگ اسی مکان میں رہتا ہے اور اس کا نام بلیج ہے۔ اس کے کہنے پر ہم اس مکان میں داخل ہو گئے۔

اندر ایک بوڑھا دکھائی دیا، سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید۔ اس نے پوچھا! ”کیا چاہتے ہو—؟“

ہم نے کہا—— ”بلیج سے ملنا چاہتے ہیں!“۔ اس نے جواب

دیا کر یلیج وہ خود ہے۔

ہم نے اپنی پوری کہانی کہہ سنائی۔ سفر کا سارا حال بتایا۔ پھر اس سے سوال کیا کہ ان لاشوں کو کس طرح جہاز سے ہٹایا جائے؟

یلیج نے کہا کہ اس کی صرف ایک صورت ہے۔ ان لاشوں نے اپنی زندگی میں کسی بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور عذاب

میں مبتلا ہیں۔ اب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ جس تختے پر لاش چپکی ہوئی ہے اُسے جہاز سے اکھاڑ کر خشکی پر لایا جائے۔ اس طرح سارا سحر ٹوٹ جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ ہم اسے بالکل راز رکھیں اور آدمی تو آدمی کسی پرندے کو بھی اس واقعے کی ہوا نہ لگے۔ اس منصوبے میں کامیابی کے بعد جہاز کے سارے خزانے پر ہمیں پورا اختیار ہوگا۔ ملیچ نے بس یہ مطالبہ کیا کہ ہم اسے انعام کے طور پر اس خزانے کا ایک حقیر سا حصّہ دے دیں۔ اس کے بدلے میں وہ اور اس کے چند غلام لاشوں کو جہاز سے اٹھانے میں ہماری مدد کریں گے۔ ہم نے اس کی شرط مان لی۔ وہ خود اور اس کے پانچ غلام ہمارے ساتھ ہو لیے۔ ان کے پاس بڑی بڑی کلہاڑیاں اور کچھ دوسرے اوزار تھے۔

ہم جہاز پر واپس پہنچے تو وقت تھوڑا ہی گزرا تھا۔ دھوپ میں زیادہ تیزی نہیں آئی تھی۔ ہم نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا۔ گھنٹے بھر میں ہم نے چار لاشیں وہاں سے مع تختوں کے نکال لیں۔ ملیچ کے چند غلام لاشوں کو دفنانے کے لیے کنارے پر لے گئے۔ لوٹ کر انھوں نے بتایا کہ جوں ہی لاشوں کو انھوں نے زمین پر رکھا وہ خود

بخود مٹی کے تودوں کی طرح بکھر گئیں اور وہ قبریں کھودنے اور انھیں دفنانے کی زحمت سے بھی بچ گئے۔ دن بھر ہم لگاتار محنت کرتے رہے۔ شام ہوتے ہوتے ساری لاشیں کنارے تک پہنچادی گئیں اور آپ ہی آپ ڈھکانے لگ گئیں۔ زمین پر پہنچتے ہی وہ لاشیں خود بخود مٹی کی طرح بکھر جاتی تھیں۔ مٹی مٹی میں مل گئی۔

اب صرف کپتان کی لاش بچی تھی، جہاز کے مستول سے چپکی ہوئی۔ ہم نے اس کے ماتھے سے کیل نکالنی چاہی۔ مگر ناکام ہوئے۔ ہم بال بھر بھی اُسے ہلا نہ سکے۔ یا خدا! یہ کیا معمّہ ہے؟ اب جہاز کے پورے مستول کو کس طرح جہاز سے الگ کرکے زمین تک لے جایا جائے؟ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لیکن ملیچ کے پاس اس سوال کا جواب بھی موجود تھا۔ اس نے ایک غلام کو حکم دیا کہ ایک برتن لے کر کنارے پر جائے اور اسے مٹی سے بھر کر واپس لائے۔ غلام حکم بجالایا۔ ملیچ نے برتن اپنے ہاتھ میں سنبھالا۔ منھ ہی منھ میں کوئی منتر پڑھا اور چٹکی بھر مٹی برتن سے نکال کر کپتان کی لاش پر چھڑک دی۔ اچانک کپتان نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ پتلیاں حرکت میں آگئیں۔ پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور اس کی پیشانی سے زخم کی جگہ پر خون کا فوارہ سا ابل پڑا۔ اب وہ کیل آسانی سے نکل آئی اور وہ بے سدھ ہو کر ایک غلام کے

بازوؤں میں جھول پڑا۔

"یہاں مجھے کون لایا ہے؟" چند لمحوں بعد اس نے سوال کیا۔ ملیح نے جواب دینے کے بجائے بس انگلی اٹھا کر میری طرف اشارہ کیا۔

"میں تمھارا شکر گزار ہوں پیارے اجنبی!" کپتان نے کہا ——— "تم نے بہت بڑے عذاب سے مجھے نجات دلائی ہے۔ پچھلے پچاس برس میں نے اسی تکلیف میں گزارے ہیں۔ ہر رات میری رُوح جسم میں لوٹ آتی تھی اور مجھ سے کہتی تھی کہ زمین پر چلو! آج میرے ماتھے پر مٹی لگتے ہی میری روح کو قرار آگیا ہے۔ اب میں اپنے عزیزوں تک پہنچ جاؤں گا!"

میں حیران ہوا۔ پھر اس سے درخواست کی کہ وہ اپنا قصّہ پورے کا پورا سنائے۔

اس نے اپنا قصّہ اس طرح شروع کیا: "اب سے پچاس برس پہلے، میں الجزائر کا ایک معزز شہری تھا۔ پھر بدی کا نشہ مجھ پر طاری ہوا اور سر میں سمائی کہ کسی ترکیب سے دولت حاصل کروں۔ سو میں نے ایک جہاز خریدا اور سوچا کہ سمندروں میں آتے جاتے تجارتی جہازوں کا مال لوٹا جائے۔

وقت گزرتا رہا۔ ایک روز ایک درویش ہمیں ملا اور ہم سے درخواست کی کہ اپنے جہاز پر ہم اُسے کچھ دور پہنچا دیں۔ میرے

ساتھی بدمعاش قسم کے لوگ تھے۔ درویش سے بھی وہ ہنسی مذاق کرتے رہتے۔ اس پر پھبتیاں کستے۔ اسے تنگ کرتے، آخر ایک روز درویش کو جلال آگیا۔ اس نے ہمیں بد دعا دی۔ میں اس وقت اپنے ایک رفیق کے ساتھ مے نوشی میں مصروف تھا۔ مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے خنجر نکالا اور اسے سیدھا درویش کے قلب میں اتار دیا۔ درویش نے مرتے مرتے ہمیں ایک اور بد دعا دی۔ "تم جب تک زمین پر نہیں پہنچ جاتے، نہ مردوں میں ہو گے نہ زندوں میں!" یہ کہتے کہتے اس نے اپنی آنکھیں موندلیں اور جان سے گزر گیا۔ ہم سب نشے میں تھے۔ اس کی بد دعا کا بھی ہم نے کچھ اثر نہ لیا اور اس کی لاش سمندر میں پھینک دی۔ آخر کار اس کی بد دعا رنگ لائی۔ اسی رات میرے کچھ ساتھی کسی بات پر مجھ سے ناخوش ہو گئے اور میرے خون کے پیاسے نظر آنے لگے۔ میں اور میرے چند رفیق ایک طرف تھے۔ بقیہ دوسری طرف۔ دونوں جتھوں میں زبردست جنگ ہوئی۔ ہم ہار گئے۔ دشمنوں نے مجھے مستول سے لگا کر میری پیشانی میں ایک لمبی میخ ٹھونک دی۔ میرے بقیہ ساتھی بھی مارے گئے۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ ساتھی جو ہمارے دشمن ہو گئے تھے اپنے زخموں کی تاب نہ لا کر یکے بعد دیگرے چل بسے۔ جہاز ایک قبرستان

بن گیا۔ میری آنکھوں کی روشنی کم پڑتی گئی اور سانس رک رک کر چلنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں بھی بس تھوڑی دیر کا مہمان ہوں۔ لیکن میں پوری طرح مرنے کے بجائے ایک قسم کے فالج کا شکار ہو گیا تھا۔ اگلی رات، ٹھیک اسی وقت جب ہم نے درویش کی لاش سمندر میں پھینکی تھی، مجھے ایسا لگا کہ ایک بار پھر میں زندہ ہو گیا ہوں۔ میرے تمام ساتھی بھی کروٹ لے کر اُٹھ بیٹھے۔ ہم سب ہوش میں تھے۔ لیکن صرف وہی کرنے پر مجبور، جو کچھ ہم نے پچھلی رات کیا تھا۔ اے عزیز! پچاس برس اسی حال میں گزر گئے۔ ہم مُردوں میں ہیں نہ زندوں میں۔ پھر ہم بھلا کیوں کر زمین تک پہنچ سکتے تھے؟ ہم تو یہ دعا بھی کرتے تھے کہ کوئی بھیانک طوفان آئے اور جہاز کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ شاید اس طرح ہم ڈوب کر سمندر کی تہہ تک جا پہنچیں اور مٹی کا لمس ہمیں کھوئی ہوئی زندگی بخش دے لیکن ہماری قسمت میں یہ بھی نہ تھا۔ اب میں مر تو سکتا ہوں! میرے عزیز! تم نے اس قہر سے مجھے نجات دلائی ہے میں تمھارا شکر گزار ہوں اور اظہار تشکر کے طور پر اپنا جہاز اور اپنا سارا خزانہ مال و اسباب، جو کچھ بھی جہاز پر ہے، تمھاری نذر کرتا ہوں ——— !"

یہ کہتے کہتے کپتان لڑھک گیا۔ ہم اسے بھی کنارے لائے
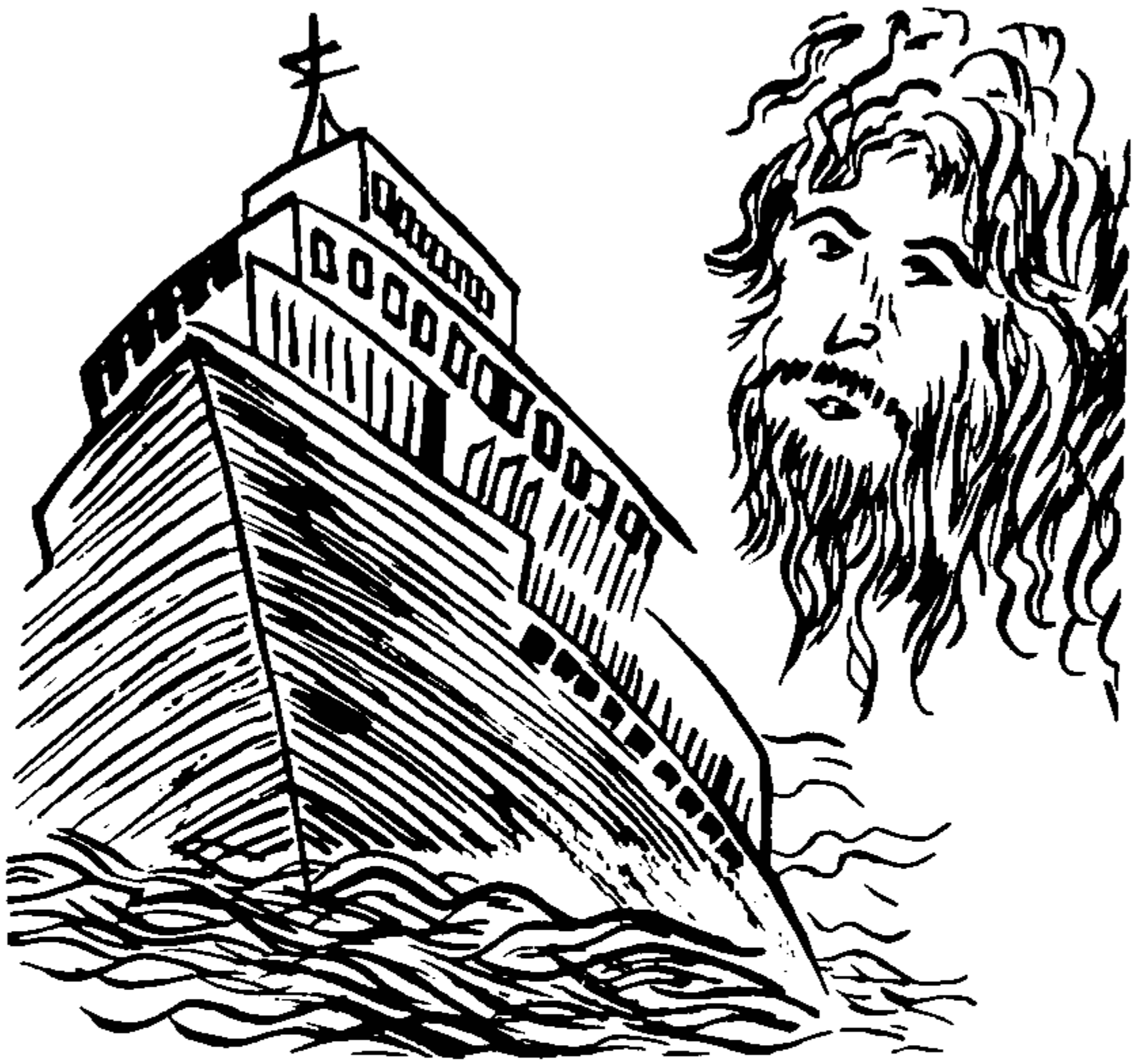
اور اس کا بدن بھی خاک ہو کر مٹی میں مل گیا۔ ہم نے اس کی مٹی ایک صندوقچے میں سمیٹی پھر اس صندوقچے کو کنارے ہی پر دفن کر دیا۔

اب ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور دوسری باتوں پر توجہ کی۔ سب سے پہلے تو ہم نے یہ کیا کہ ملیج اور اس کے غلاموں کو ڈھیر سارے تحفے تحائف، انعام و اکرام سے نوازا۔ پھر کچھ ملازم تلاش

کیے جو آگے کے سفر اور تجارت میں ہمارا ہاتھ بٹا سکیں۔ پھر ہم نے مزدور اور کاریگر بلوائے اور ان سے جہاز کی مرمت کرائی۔
جہاز پر جو مال و اسباب لدا ہوا تھا اسے شہر لے جا کر بیچ دیا اور بدلے میں دوسری انواع و اقسام کی چیزیں خریدیں۔ خوب نفع کمایا۔ پھر کاروبار میں خدا نے اتنی برکت دی کہ نو مہینے بعد جب میں ملک ملک کی سیر کرتا، طرح طرح کے عجائبات دیکھتا ہوا واپس اپنے وطن بندر ابہنچا تو دوست عزیز، پڑوسی اور اہل شہر میرا ٹھاٹ باٹ دیکھ کر حیران ہوئے۔ کچھ نے حسد کیا۔ کچھ خوش ہوئے اور رشک کیا۔ بعضے یہ سمجھے کہ اس حقیر و فقیر نے شاید جواہرات کی وہ وادی ڈھونڈ نکالی ہے جس کی کھوج سند باد جہازی کو تھی۔

عزیزو! جب سے اب تک یہ رسم چلی آتی ہے کہ بلزورا کا ہر نوجوان عمر کے اٹھارویں برس کی حد پار کرتے ہی قسمت آزمائی کے لیے میری طرح گھر چھوڑ کر نکل جاتا ہے اور شکر ہے اُس پروردگار کا کہ اُس کے کرم سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ نفع کماتا ہے پھر وطن لوٹ آتا ہے۔ میں نے واپسی کے بعد سے آسائش کی زندگی گزاری ہے۔

ہر پانچویں برس حج کو جاتا ہوں اور خدا کے حضور

سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ بھوتوں کے جہاز کا کپتان اور اس کے جاں نثار رفیقوں کی خطائیں اللہ معاف کرے اور ان کی مغفرت فرمائے۔"

اگلے روز قافلے نے ایک اور منزل طے کرلی۔ پھر جب اہلِ کارواں سفر کی تکان اتارنے کے لیے ایک پُر فضا مقام پر قیام کے ارادے سے رُکے اور کھا پی کر ساتھ بیٹھے تو سلیم نے اپنے ساتھیوں میں اسے جو سب سے کم عمر تھا، مخاطب کیا اور کہا:

"تم عمر میں ہم سے چھوٹے ہو اور تمھاری صحت کی شادابی دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ تم نے کبھی رنج نہیں کھینچے۔ سو اب تم ہمیں کوئی دلچسپ قصہ سناؤ تاکہ اگلے سفر کے لیے ہم تازہ دم ہو سکیں۔"

اس نوجوان نے کہ نام جس کا ملیح تھا یہ سُن کر ایک قہقہہ لگایا اور بولا:

"تمھارا حکم سر آنکھوں پر! مگر رسم دنیا ہے کہ چھوٹے اپنے بڑوں کو پہلے موقع دیتے ہیں۔ زالیوکوس عمر اور تجربے میں میرے بزرگ ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آٹھوں پہر وہ کسی سوچ میں گم رہتے ہیں اور چہرے پر متانت چھائی رہتی ہے۔ ہم پہلے ان سے ان کی کہانی سنیں تاکہ ان کی اداسی کا کچھ بھید کھلے!

زالیوکوس ایک یونانی تاجر تھا، حسین چہرہ، مضبوط جسم اور عمر بھی ابھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ یہ بات اور ہے کہ اس کے چہرے پر ہمیشہ سنجیدگی اور اداسی طاری رہتی۔ اس کا عقیدہ اس کے ساتھیوں سے مختلف تھا، پھر بھی سب اُس کی عزّت کرتے تھے اور اس کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے۔ زالیوکوس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا۔

ملیج کی باتیں سُن کر اس نے ایک پل کی خموشی کے بعد دھیرے سے کہا۔

"یہ میری عزّت افزائی ہے۔ میں تم سب سے اپنا کوئی راز چھپا کر نہیں رکھنا چاہتا۔ دیکھو! میرا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ میں تمھیں بتاؤں گا۔ تب تم خود ہی جان جاؤ گے کہ میری اداسی کا بھید کیا ہے۔ تمھیں یہ پتا بھی چل جائے گا کہ میں اتنا چپ کیوں رہتا ہوں۔ تو سنو! یہ کہانی کٹے ہوئے ہاتھ کی ہے ــــــ"

(اگلی کہانی اس سلسلے کی اگلی کتاب میں)

مکتبہ پیامِ تعلیم جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

کٹا ہوا ہاتھ

شمیم حنفی

مکتبہ پیامِ تعلیم جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

کٹا ہوا ہاتھ

شمیم حنفی

تقسیم کار
صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025
شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

اگست ۱۹۹۶ء تعداد 1000 قیمت 7/50

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

یہ کتاب

حیران کر دینے والے واقعات اور سر چکرا دینے والے کرداروں کی لمبی کہانی کے سلسلے کی دوسری کتاب ہے۔
اریذان نامی پراسرار لٹیرے کی جو کہانی پچھلی کتاب میں شروع ہوئی تھی، وہ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس کتاب میں بھی آپ کی ملاقات اریذان سے ہوگی۔ اس کا قصہ ختم ہوگا اس سلسلے کی اگلی یعنی تیسری کتاب میں ـــ مگر کہانیوں کا یہ پورا سلسلہ کہیں پانچ یا چھے کتابوں میں جا کر مکمل ہوگا۔
اس کتاب میں دو کہانیاں شامل ہیں۔ ایک تو کٹے ہوئے ہاتھ کی کہانی۔ دوسری فاطمہ کی کہانی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ کہانیاں الگ الگ بھی اچھی لگتی ہیں اور ایک سلسلے کا حصّہ ہونے کے باوجود ادھوری محسوس نہیں ہوتیں۔
میں نے پچھلی کتاب میں عرض کیا تھا کہ یہ کہانیاں ترجمہ کی گئی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں پڑھتے وقت یہ خیال

نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے کہانیوں کی فضا اور ماحول میں ضروری تبدیلیاں کی ہیں۔ زبان کا انداز بھی سنانے والا رکھا ہے۔ انسان نے لکھنا تو بہت بعد میں سیکھا۔ کہانیاں سننے اور سنانے کا رواج اُس وقت بھی تھا جب کتابیں لکھنے اور چھاپنے کا چلن شروع نہیں ہوا تھا۔

اسی لیے تو کتنی ہی کہانیاں ہم تک سینہ بہ سینہ پہنچی ہیں۔ وہ کہانیاں کس نے گڑھی تھیں؟ کب گڑھی تھیں؟ کچھ پتا نہیں۔

ان کہانیوں کے بارے میں بھی بس اتنا جان لیجیے کہ اپنی موجودہ صورت میں یہ کہانیاں ہاف نامی ایک بزرگ نے کوئی دو سو برس پہلے لکھی تھیں۔

شمیم حنفی

۱۷ رمئی ۱۹۸۶ء

۵

کٹا ہوا ہاتھ

زالیوکوس نے ایک پل کے لیے اپنی آنکھیں بند کیں۔ لوگ اُس کے اور قریب سمٹ آئے۔ اور زالیوکوس نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

میری پیدائش قسطنطنیہ میں ہوئی۔ میرے والد ریشمی کپڑوں اور عطریات کا کاروبار کرتے تھے۔ اُنھیں کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ مجھے ابتدائی تعلیم خود والد نے دی۔ پھر مجھے ایک مذہبی پیشوا کے سُپرد کر دیا۔ اُن کی خواہش تھی کہ بڑا ہو کر میں ان کا کاروبار سنبھال

لوں۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ اس ناچیز کو حکمت سے زیادہ دلچسپی ہے تو اپنے کچھ دوستوں سے مشورے کے بعد میرے لیے انھوں نے طبابت کا پیشہ تجویز کیا۔ اُن دنوں قسطنطنیہ میں اچھے طبیب بہت کم تھے۔ سو مالی اعتبار سے بھی یہ پیشہ خاصا نفع بخش ثابت ہوتا۔

ملک فرانس کے کئی باشندوں کی میرے والد سے رسم و راہ تھی۔ ایک روز ایک فرانسیسی میرے گھر آیا۔ اس نے والد کو بتایا کہ اس کے ملک میں طبابت کے پیشے کی تربیت بہت اچھی دی جاتی ہے کیوں نہ مجھے بھی فرانس بھیج دیا جائے۔ اس بزرگ نے یہ بھی کہا کہ جب وہ لوٹ کر اپنے ملک کو جائے گا تو مجھے اپنے ساتھ لیتا جائے گا۔ والد کو یہ تجویز پسند آئی تین ماہ بعد سفر مقرر ہوا۔ میں بھی دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اس طرح دنیا دیکھنے کا موقع ملے گا۔ سیر تماشے سے دلچسپی خدا داد تھی۔

اس فرانسیسی بزرگ نے جب ہمارے ملک میں اپنا کام ختم کر لیا اور وطن واپس جانے کی تیاری شروع کی تو میں نے بھی سفر کے انتظامات مکمل کیے۔ جس روز شام ڈھلے ہمیں رخصت ہونا تھا والد نے

۷

مجھے اپنی خواب گاہ میں طلب کیا۔ ایک میز پر عمدہ عمدہ ملبوسات، اسلحہ جات اور سونے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔
والد نے اس ناچیز کو گلے سے لگایا اور بولے:
"یہ سب کچھ تمہارا ہے۔ جو اسلحے تم دیکھ رہے ہو تمہارے دادا حضور نے مجھے اُس وقت عطا کیے تھے جب میں نے تلاشِ معاش میں پردیس کے سفر کی ٹھانی تھی۔ تم ان کا استعمال صرف اپنی حفاظت کے لیے کرنا۔ بے سبب کسی کو ضرب پہنچانے کا خیال ہرگز جی میں نہ لانا۔ اور سونے کا یہ ڈھیر میں نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک حصہ تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔ دوسرا میرے لیے چھوڑ دو۔ اور تیسرے حصے کو صرف اس وقت ہاتھ لگانا جب تم پر اچانک کوئی بُرا وقت آن پڑے۔"
یہ کہتے کہتے والد کا گلا بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ شاید انھیں وہم ہو گیا تھا کہ اس شام کے بعد دوبارہ ملنا ہمارے نصیب میں نہیں ہے۔
سفر جوں توں تمام ہوا۔ چھٹے دن ہم پیرس جا پہنچے۔ اُس مردِ بزرگ نے جس کا میرے والد سے یارانہ تھا، اور جو اب مجھے بھی مثل دوست کے عزیز رکھتا تھا میرے لیے ایک کمرہ کرائے پر حاصل کیا۔ پھر مجھے صلاح دی
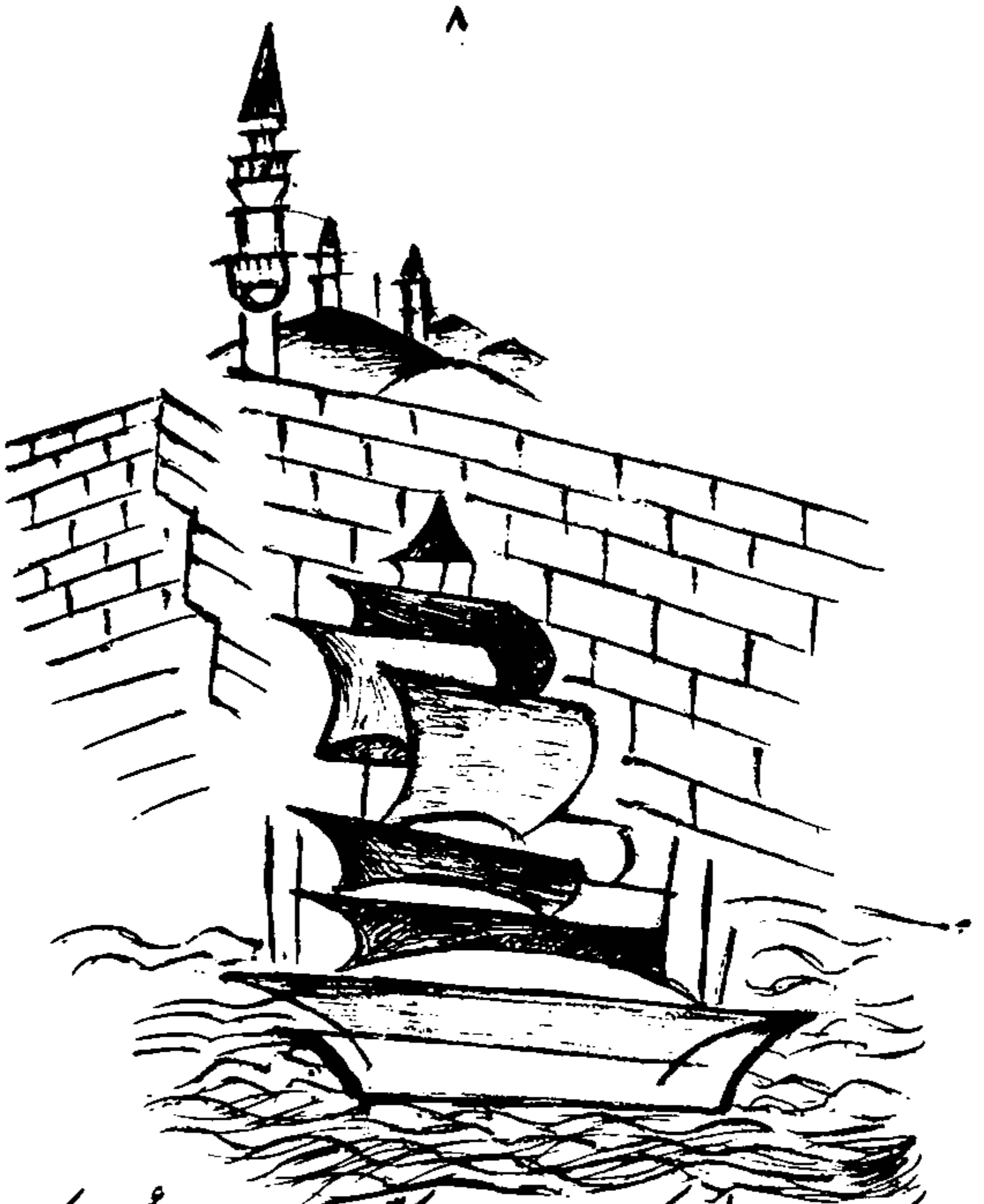
کہ اپنے مال کی طرف سے چوکنا رہوں اور اُس کی
حفاظت کروں۔
رفیقو! اس ناچیز نے تین برس اُس آبادی میں
گزارے۔ طبابت کے پیشے سے متعلق ہر بات سیکھ لی۔

جرّاحی میں ماہر ہو گیا۔ ہزاروں نسخے از بر ہو گئے۔ اِس عرصے میں بہت کم لوگوں سے میری دوستی رہی۔ اُس ملک کے لوگوں کی اخلاقی حالت اس ناچیز کو قدرے بیزار رکھتی تھی۔ لوگ طرح طرح کے لہو و لعب میں مبتلا رہتے تھے۔

اب گھر کی یاد بھی ستانے لگی تھی۔ والد کے احوال سے بھی میں یکسر بے خبر تھا۔ سوچا، جلد از جلد وطن لوٹ جاؤں۔ ایک جماعت اُن دنوں قسطنطنیہ کے سفر کا ارادہ باندھ رہی تھی۔ میں نے اس کے افراد سے ملاقات کی اور کہا کہ اگر مجھے بھی ساتھ لے جانے پر وہ رضامند ہو تو راستے بھر ان کی صحت اور دوا علاج کی خدمت انجام دوں گا اور اس کے عوض اُن سے ایک پائی نہ لوں گا۔ انھوں نے یہ خدمت قبول کرلی اور میں چین آرام سے اُن کے ساتھ قسطنطنیہ پہنچ گیا۔

وہاں جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ مکان کے صدر دروازے پر ایک بڑا سا قفل لگا ہے۔ پڑوسی اتنے عرصے بعد مجھے جیتا جاگتا دیکھ کر حیران ہوئے پھر بتایا کہ والد اس ناچیز کے دو ماہ قبل ایک بیماری کے ہاتھوں فوت ہو چکے ہیں۔ گھر کی چابی اُس مذہبی پیشوا

کے پاس تھی جس نے مجھے کچھ عرصہ تعلیم دی تھی۔ میری آمد کا حال سن کر وہ بزرگ خود آیا اور چابی ساتھ لایا۔ میں نے قفل کھولا اور ڈیوڑھی میں قدم رکھا۔ آنکھیں چار طرف والد کو ڈھونڈتی تھیں۔ گھر میں سارا مال اسباب جوں کا توں دھرا تھا۔ البتہ اشرفیوں کا وہ ڈھیر جو والد نے کسی بُرے وقت کے لیے محفوظ رکھ چھوڑنے کی تاکید کی تھی، غائب تھا۔ پیشوا نے کہا کہ والد نے انتقال سے پہلے وہ رقم معبد کی تعمیر کے لیے دے دی تھی۔

میں کیا کرتا؟ ناچار اُس کی بات مان لی ویسے

یہ بھید میری سمجھ میں نہ آیا۔ کوئی گواہ تو تھا نہیں کہ اپنی حمایت کے لیے حاضر کردیتا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کم از کم گھر اور گھر کا ساز و سامان تو محفوظ رہ گیا۔

عزیزو! یہ اس ناچیز پر بدنصیبی کا پہلا وار تھا۔ پھر تو یکے بعد دیگرے مصیبتیں آتی گئیں اور جینا دشوار ہوگیا۔ طبابت میں کوئی خاص کامیابی نہ ملی۔ میرے والد مرحوم اُس ملک کے ایک بااثر شہری تھے وہ زندہ ہوتے تو اس ناچیز کو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ اُن کے اُٹھ جانے سے میں ایک دم بے سہارا ہوگیا تھا میں نے لاکھ جتن کیے کہ جو تجارتی سامان گھر میں موجود ہے اُسی کو اونے پونے فروخت کروں۔ لیکن اب نئے نئے تاجروں کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ میرے مال کا کوئی خریدار نہ تھا۔

ایک روز خیال آیا کہ ملک فرانس میں ہمارے یہاں کی اشیاء خاصی پسند کی جاتی ہیں کیوں نہ وہیں چل کر قسمت آزمائی کی جائے؟ میں نے سفر کی تیاریاں شروع کردیں۔

قیاس درست نکلا۔ جو بھی سامان تجارت کا میں اپنے ساتھ لے گیا تھا، سب کا سب اچھے داموں پر

بک گیا۔ میں نے اور سامان وہیں کے بازاروں سے خریدا اور اُسے بھی وہیں کے وہیں بیچ دیا۔ خوب منافع ہاتھ آیا۔ طبابت کا کام بھی چل نکلا۔ میں جس جس شہر میں جاتا، وہاں پہنچتے ہی ڈگڈگی بجوا کر اعلان کرا دیتا کہ ایک حاذق یونانی طبیب اُس شہر میں وارد ہوا ہے۔ مریضوں کی بھیڑ لگ جاتی۔

میں نے تھوڑے ہی عرصے میں بہت دولت کمائی۔ پھر جی میں یہ سمائی کہ اب کسی اور ملک کا رُخ کیا جائے۔ میں نے بہت سارا فرانسیسی سامان خریدا اور اطالیہ کی راہ لی۔ شہر فلورنس میں اپنا ڈیرا جمایا۔ خوبصورت بستی تھی۔ ایک دکان کرایہ پر لی۔ قیام کا انتظام ایک سرائے میں ہو گیا جو دکان سے قریب ہی تھی۔ پُرفضا مقام تھا اور ہر طرح کا آرام اس سرائے میں میسّر تھا۔ جلد ہی لوگ مجھے ایک تاجر اور ایک طبیب کی حیثیت سے جان گئے۔ کاروبار یہاں بھی چمک گیا۔ عزیزو! سبب اس کامیابی کا یہ تھا کہ ہر چند میں اپنا مال اونچے داموں پر بیچتا تھا، مگر لوگ میرے حسن اخلاق کے گرویدہ تھے۔

ابھی فلورنس میں دس روز گزرے تھے کہ

ایک شام، جب میں دن بھر کا حساب کتاب دیکھ رہا تھا، ایک صندوقچے میں مجھے ایک رقعہ ملا۔ اس پر لکھا تھا کہ اُسی دن جب آدھی رات اِدھر ہو اور آدھی رات اُدھر، میں ایک معیّنہ مقام پر پہنچ جاؤں۔ خدا جانے کون اس رقعے کا لکھنے والا تھا۔ بہت سوچا، کچھ یاد نہ آیا۔ اس بستی کے کسی بھی شخص سے میرے قریبی تعلقات نہ تھے۔ پھر یہ رقعہ کس نے بھیجا تھا؟ آخر یہ سوچ کر اس الجھن سے نجات پائی کہ کسی مریض کو خفیہ طریقے سے دیکھنا ہوگا۔ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ ایسا ہو چکا تھا۔ میں نے جانے کا ارادہ کر لیا۔ ساتھ ہی والد مرحوم کے دیے ہوئے کچھ ہتھیار بھی سنبھال کر رکھ لیے کہ کوئی انہونی بات ہو جائے تو اپنی حفاظت کر سکوں

آدھی رات سے اک ذرا پہلے میں چل دیا۔ اُس پُل پر جا پہنچا جہاں مجھے بلایا گیا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا اور ایک عجیب سی سنسنی۔ ٹھنڈ غضب کی تھی۔ پورا چاند آسمان پر روشن تھا۔ نیچے دریا کی لہریں چاندنی میں جگمگا رہی تھیں۔ آس پاس نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد۔ اتنے میں آدھی رات کا گجر بجا۔ میں نے کچھ آہٹ سی محسوس کی اور چونک کر سامنے دیکھا تو نظر ایک

لمبے تڑنگے شخص پر پڑی۔ اُس نے سرخ رنگ کے لبادے میں اپنے آپ کو چھپا رکھا تھا۔ چہرہ بھی ڈھکا ہوا تھا۔

مجھے کچھ ڈر سا لگا۔ پھر خود کو سنبھالتے ہوئے میں نے کہا: "کیا تم نے مجھے بلایا ہے؟"

"ہاں! میرے پیچھے پیچھے آؤ" لبادے والے نے بس اتنا جواب دیا اور ایک طرف چل پڑا۔ میرے دل میں کچھ اور دہشت سما گئی "جاؤں کہ نہ جاؤں؟" ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا۔ پھر اُسے مخاطب کیا: "اتنا تیز نہ چلو دوست! پہلے یہ تو بتاؤ کہ ہمیں جانا کہاں ہے، پھر مجھے اپنا چہرہ دکھاؤ کہ میں تمھیں سمجھ تو سکوں!"

"زالیوکوس! اگر تم نہیں آنا چاہتے تو نہ آؤ!" اجنبی نے زہریلے لہجے میں کہا اور تیز تیز چلنے لگا۔

میں چیخ کر بولا ـــ "تو کیا تم مجھے احمق سمجھتے ہو؟ بلا جانے بوجھے اس سنسان اور سرد رات میں تمھارے ساتھ چلا چلوں؟" یہ کہتے ہوئے میں نے لپک کر اُسے پکڑنے کی کوشش کی۔ ایک ہاتھ میں اپنا خنجر سنبھالا، دوسرا ہاتھ اس کے لبادے پر ڈالا۔ اجنبی تو لبادے سے نکل کر یہ جا وہ جا! بس لبادہ میرے ہاتھ میں رہ گیا۔

غصہ تو بہت آیا۔ مگر میں نے یہ سوچ کر دل کو سمجھایا کہ اس کا لبادہ میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔ شاید اس کی مدد سے کچھ پتا چلے، بھید کھلے۔ میں نے لبادہ اپنے کاندھے پر ڈالا اور گھر کی راہ لی۔ ابھی مشکل سے سو گز کا راستہ طے کیا ہوگا کہ کسی نے مجھے دھیرے سے چھوا اور سرگوشی کے انداز میں کہا: "آج رات کچھ بھی نہیں ہو سکتا سردار، اپنی حفاظت کرو!"

میں نے مڑ کر اسے دیکھنا چاہا۔ مگر پلک جھپکتے میں وہ اجنبی بھی غائب ہو چکا تھا۔ یہ بات صاف تھی کہ اس نے سرخ لبادے والے کو خبردار کرنا چاہا تھا اور مجھ پر اسے اس لمبے تڑنگے اجنبی کا دھوکا ہوا تھا۔

دوسرے دن میں سوچتا رہا کہ اب کیا کروں؟ پہلے جی میں آئی کہ اس لبادے کے سلسلے میں اعلان کروا دوں۔ جس کا ہو آئے اور لے جائے۔ پھر خیال آیا کہ یہ کیا حماقت ہے۔ جسے غرض ہو گی آپ ہی آئے گا۔ میں نے بہت غور سے لبادے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ بہت عمدہ قیمتی مخمل کا بنا ہوا تھا اور سونے کے تاروں سے کڑھا ہوا۔ میں نے آخر میں ایک ترکیب سوچی۔ لبادے کو دکان پر ٹانگ دیا اور جان بوجھ کر اس کی قیمت

اونچی رکھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے کوئی خریدتا ہے یا نہیں۔ اس لمبے تڑنگے اجنبی کو صرف اس کے غیر معمولی قد کی وجہ سے میں ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔

کئی لوگ اس لبادے کو دیکھنے کے لیے آئے لیکن کوئی بھی دو سو اشرفیوں میں مول لینے پر آمادہ نہیں ہوا۔ ایک شخص جو لالچ بھری نظروں سے لبادے کو دیکھ رہا تھا اس سے میں نے پوچھا کہ اس شہر میں کسی اور دکان پر بھی ایسا لبادہ مل سکتا ہے؟ اُس نے کہا "نہیں!"

دن گزرا۔ شام آئی۔ اتنے میں ایک نوجوان دکان میں داخل ہوا۔ لبادے پر نظر کی۔ دو سو اشرفیاں گن کر نکالیں اور بولا۔۔۔ "مجھے یہ لبادہ اتنا پسند آیا ہے کہ اس کے لیے میں نے سارا سرمایہ خرچ کر دیا۔۔۔ یہ لو!"

میں چکرا گیا۔ مجھے ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ کوئی گاہک اتنے مہنگے داموں پر بھی اس لبادے کو خرید سکتا ہے۔ اب کیا کروں؟ یہ سوچ کر خوشی بھی ہوئی کہ مجھے بیٹھے بٹھائے اتنی دولت ہاتھ لگ گئی۔

نوجوان اتنی دیر میں لبادہ لے کر باہر جا چکا تھا۔ ایک لمحے بعد وہ واپس آیا۔ مجھے ایک رقعہ تھمایا اور بولا "یہ کاغذ شاید غلطی سے لبادے کی جیب میں رہ گیا ہے۔ یہ لو!"
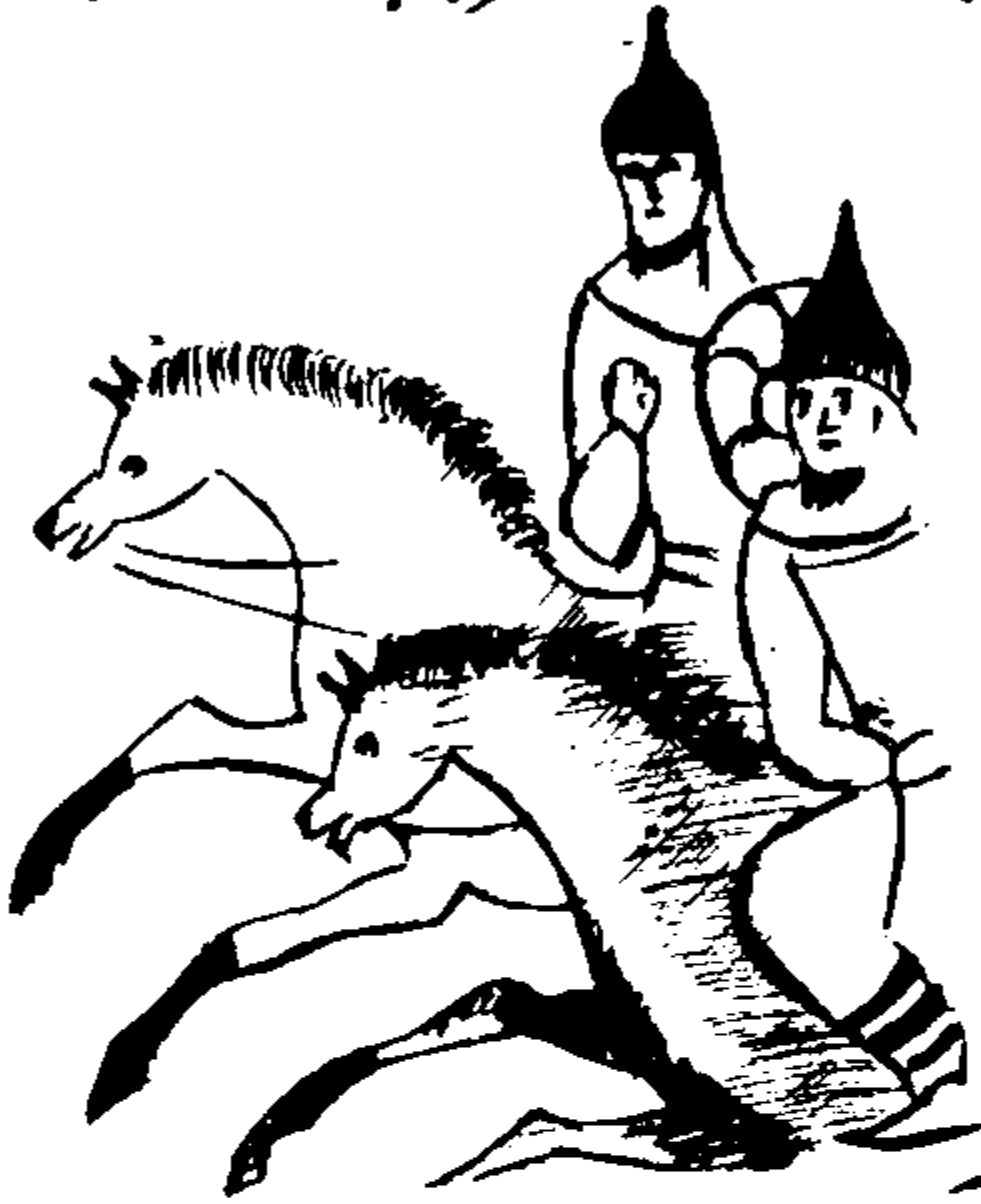
میں نے جلدی سے اسے پڑھا، لکھا تھا "یہ لبادہ لے کر فلاں مقام پر آج رات پہنچو۔ تمھیں وہاں چار سو اشرفیاں ملیں گی" اب تو میرے حواس گم ہو گئے۔ مجھے دو سو اشرفیاں اور مل سکتی ہیں ___ یہ سوچتا ہوا میں دروازے کی طرف لپکا اور چند لمحوں بعد اُس نوجوان کو جا لیا۔ میں نے کہا "اپنی رقم واپس لے لو اور یہ لبادہ مجھے دے دو!"

پہلے تو وہ سمجھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ لیکن مجھے سنجیدہ دیکھ کر خفا ہو گیا اور مجھ پر گرجنے برسنے لگا۔ ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔ میں نے لبادہ چھین لیا۔ اس لیے

صدا لگائی اور شہر میں گشت کرنے والے محافظ دستے کے لوگ آن پہنچے۔ مجھے پکڑ کر قاضی کی عدالت میں لے گئے۔ معاملے کی شنوائی ہوئی۔ فیصلہ میرے خلاف ہوا۔ اب میں نے یہ گزارش کی کہ نوجوان کی دو سو اشرفیوں کے علاوہ سو اشرفیاں میں اپنی طرف سے دینے پر تیار ہوں اگر نوجوان لبادہ مجھے واپس کر دے۔

عزیزو! نوجوان لالچ میں آ گیا۔ میں نے تین سو اشرفیاں اس کے حوالے کیں۔ لبادے پر اپنا قبضہ جمایا اور گھر کی راہ لی۔ میں اب بھی سو اشرفیوں کے فائدے میں تھا۔

بڑی بے چینی سے میں نے آدھی رات کا انتظار کیا۔ پھر گجر بجتے ہی گھر سے باہر نکل گیا اور معینہ مقام پر جا پہنچا۔

"لبادہ لائے ہو؟" اسی لمبے تڑنگے اجنبی نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! اور اس کے لیے سو اشرفیاں بھی گنوا آیا ہوں!" میں نے جواب دیا۔

اجنبی نے کہا: "مجھے دیتا ہے۔ لو یہ چار سو اشرفیاں!"

اُس نے چار سو اشرفیاں میرے سامنے ڈال دیں۔ چاندنی میں سونے کی چمک دیکھ کر میرا جی کھل اٹھا۔ میں نے جلدی جلدی تمام اشرفیاں اپنی جیبوں میں بھرلیں اور غور سے اس اجنبی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر نقاب پڑی ہوئی تھی۔ بس انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں نقاب سے جھانک رہی تھیں۔

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور بولا: "میں کیا خدمت کرسکتا ہوں؟ پیارے اجنبی! بس یہ خیال رہے کہ کوئی غیر قانونی خدمت مجھ سے نہ لینا۔"

"ڈرو مت!" اُس نے جواب دیا "مجھے تمھاری جراحی کے تجربے سے کچھ کام لینا ہے تمھیں ایک لڑکی کا سر اس کے تن سے جدا کرنا ہے!"

"کیا؟ کیا؟" میں حیرانی سے چیخ پڑا۔

اجنبی نے بہت سنجیدہ لہجے میں کہا "وہ لڑکی زندہ نہیں ہے۔ اس لیے گھبراؤ مت تمھیں ایک لاش کا سر قلم کرنا ہے!"

"میں کچھ نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ کیا معاملہ ہے؟"

میرے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

اس نے بالکل سرد لہجے میں جواب دیا ـــــ
"پوری بات سُن لو! پھر تم سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ میں تم سے کوئی نامناسب کام نہیں لینا چاہتا۔ معاملہ یہ ہے کہ میں اس ملک میں اپنی بہن کے ساتھ آیا تھا۔ یہاں ہم اپنے کچھ رشتے داروں کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ اچانک میری بہن ایک پُراسرار بیماری کے ہاتھوں چل بسی۔ کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ میرے رشتے دار اسے کل صبح دفنا دیں گے۔ لیکن ہمارے خاندان میں ایک پُرانی رسم یوں چلی آتی ہے کہ خاندان کے ہر فرد کو، چاہے کہیں بھی اُس کی موت واقع ہو، ہم اپنے اجداد ہی کی قبروں کے درمیان دفن کرتے ہیں۔ جو بدنصیب پردیس میں مرتے ہیں ان کی لاش کچھ مرہموں اور نسخوں کے ذریعے محفوظ کر لی جاتی ہے۔ میں اپنی بہن کی لاش اپنے رشتے داروں کے پاس چھوڑ دوں گا۔ لیکن اس کا سر اپنے ساتھ وطن لے جاؤں گا تاکہ بوڑھے والدین اپنی جواں مرگ بیٹی کا آخری دیدار تو کر لیں۔"

میری طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ پھر بھی میں نے خاموشی اختیار کی اور اُس کے بار بار کہنے پر اس کام کے لیے

تیار ہو گیا۔ البتہ ایک سوال مجھے رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا۔ "اگر معاملہ اتنا ہی سیدھا سادا ہے تو وہ رات کے سناٹے میں چوری چھپے یہ کام کیوں کروانا چاہتا ہے؟" طبیعت نہ مانی اور میں یہ بات پوچھ ہی بیٹھا۔ اس نے جواب اس بات کا یہ دیا کہ "رشتے دار سر قلم کرنے کی اجازت نہ دیں گے، لیکن اگر راتوں رات میں نے یہ کر لیا تو پھر انھیں کسی نہ کسی طرح مطمئن کر دوں گا۔"

میں نے یہ عذر قبول کر لیا۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم چل پڑے۔ پھر ایک عالیشان حویلی کے سامنے جا پہنچے۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ اندھیرے میں ہم رُک رُک کر قدم آگے بڑھا رہے تھے۔ ایک سیڑھی سے اُتر کر ہم ایک راہداری میں پہنچے، پھر ایک کمرے میں۔ کمرے کی چھت سے ایک فانوس لٹک رہا تھا۔ خوب روشنی تھی۔ کمرے کے ایک گوشے میں بستر پر ایک نوجوان دوشیزہ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اجنبی نے اپنا چہرہ پیچھے کی طرف موڑ لیا گویا اپنے آنسوؤں کو چھپانا چاہتا ہو۔ پھر مجھ سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

اور خود کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں نے اپنا خنجر نکالا۔ دوشیزہ کا سارا جسم ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ صرف سر چادر سے باہر تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ زرد۔ لانبے سیاہ بالوں کی لٹیں سر کے گرد بکھری ہوئی تھیں۔ وہ مرنے کے بعد بھی بالکل ایسی نظر آتی تھی جیسے گہری نیند میں غرق ہو۔ ایسی معصوم صورت دوشیزہ کی لاش کو قریب سے دیکھنا بھی میرے لیے بہت بڑی آزمایش تھی۔

میں نے خنجر سنبھالا اور ایک ہی وار میں اس کا حلق کاٹ دیا۔ اچانک ــــ اچانک ــــ لاش نے ایک سسکی لی دوشیزہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولیں اور پل بھر بعد دوبارہ بند کرلیں ــــ !

مجھے ایسا لگا کہ زمین پر میرے پاؤں جم سے گئے ہیں۔ میرے خدا! وہ لڑکی زندہ تھی جسے مُردہ سمجھ کر میں نے اس کا سر قلم کر دیا تھا۔ لیکن اب ــــ اب وہ واقعی مر چکی تھی۔ میرے خنجر کا وار بہت گہرا تھا۔

"یہ میں نے کیا کر ڈالا؟" چند لمحوں تک میرے حواس گم رہے اور رہ رہ کر سینے میں درد کی ایک لہر اُٹھتی رہی۔ تو کیا سرخ لبادے والے اجنبی نے مجھے دھوکا دیا تھا؟ یا خود اس کی بہن نے موت کا ڈھونگ رچایا تھا؟ ہو سکتا ہے ایسا ہی رہا ہو! میں اس کے بھائی سے کچھ نہ کہہ سکا۔ میری ہمّت جواب دے گئی تھی۔ چُپ چاپ میں نے لڑکی کا سر تن سے جُدا کر دیا۔ مرنے سے پہلے اس کی حلق سے ایک کراہ نکلی تھی۔ پھر اس نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ڈر سے بے حال ہو کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

راہداری میں اندھیرا تھا۔ چراغ اپنے آپ گُل ہو گئے تھے اور سُرخ لبادے والے کا آس پاس کہیں پتا نہ تھا۔ میں دیوار کے سہارے چلتا ہوا

زینے تک پہنچا۔ پھر بہ ہزار خرابی گرتا پڑتا نیچے اُتر آیا۔ چاروں طرف سنّاٹا تھا۔ صدر دروازہ پورے کا پورا کھلا ہوا تھا۔ باہر نکل کر میں نے ایک لمبا سانس لیا۔ ابھی تک دل میں دہشت سمائی ہوئی تھی۔ میں گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر بستر پر گر کر تکیے میں منھ چھپا لیا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ سب کچھ بھول جاؤں جو ہو چکا ہے۔ لیکن ـــــ نیند میری آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ بڑی مشکل سے صبح ہوتے ہوتے میرے اوسان بحال ہوئے۔ مجھے یقین تھا کہ جس اجنبی نے میرے ہاتھوں یہ جرم کرایا ہے، مجھے بے سہارا نہ چھوڑے گا اور میری مدد کو آئے گا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دُکان پر چلا جاؤں اور لوگوں کے سامنے اس طرح پیش آؤں جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ مگر وائے افسوس! ایک نئی مصیبت سر پر کھڑی تھی۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ اپنا خنجر اور چاقو تو میں وہیں چھوڑ آیا ہوں۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بوکھلاہٹ میں کہیں اور گرا دیا ہو۔ اب اگر میرے ہتھیار کسی کو مل گئے تو ہو سکتا ہے کہ پکڑا جاؤں!

معمول کے مطابق میں نے دُکان کھولی۔ میرا

پڑوسی جسے اِدھر اُدھر کی غپ شپ میں بہت مزا آتا تھا، اس نے دروازے سے جھانک کر روز کی طرح مجھے دیکھا اور خیریت پوچھی۔ پھر اس نے کہا ــــ "تمھیں کچھ پتا بھی ہے؟ پچھلی رات کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" میں نے مری ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"ارے! تم نے سُنا ہی نہیں؟" اس نے حیرت سے کہا "پچھلی رات گورنر کی بیٹی بنا کا کو کِسی نے قتل کر دیا۔ کیسی حسین دوشیزہ تھی۔ ابھی کل ہی میں نے اسے اس کے منگیتر کے ساتھ سیر کے لیے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ آج ان دونوں کی شادی ہونے والی تھی!"

اس کا ہر ہر لفظ چاقو کی طرح میرے دل میں اترتا گیا۔ اور یہ عذاب مجھے کئی بار جھیلنا پڑا۔ اس روز جو کوئی بھی دُکان پر آتا بس یہی قصّہ دہراتا۔ لوگ بھانت بھانت کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ مجھے حقیقت معلوم تھی لیکن میں ایسا انجان بنا بیٹھا رہتا جیسے یہ سب کچھ میں پہلی بار سُن رہا ہوں۔ دوپہر ہوتے ہوتے ایک شخص دُکان میں داخل ہوا۔ وہ مقامی

عدالت کا ایک کارندہ تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اکیلے میں مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ میں اسے دُکان کے عقبی کمرے میں لے گیا۔

اس نے ایک تھیلے سے میرے اسلحے نکالے۔ پھر گہری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ آپ کے ہیں؟"

میں نے سوچا کہ صاف انکار کر دوں۔ لیکن میرے پڑوسی دروازے سے جھانک رہے تھے۔ اس لیے جھوٹ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ سب اچھی طرح میرے خنجر اور جرّاحی کے دوسرے آلات کو پہچانتے تھے۔ میں نے جواب دیا کہ ہاں یہ سب کچھ میرا ہے۔ کارندے نے کہا کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔ ناچار میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہم ایک بہت بڑی سنی عمارت کے سامنے پہنچے۔ یہ شہر کی سرکاری جیل تھی۔ وہاں مجھے ایک کوٹھری میں قید کر دیا گیا۔

میں اپنے آپ کو ایک دم بے سہارا محسوس کر رہا تھا۔ کال کوٹھری کی تنہائی میں مجھے بار بار یہ خیال ستاتا رہا کہ میں نے ایک قتل کر دیا ہے، اپنے ارادے سے نہ سہی، دھوکے میں آکر۔ مگر، بہر حال، جرم تو

میرا ہی ہے ۔ مجھے روپے کی ہوس نے اس حال کو پہنچایا تھا ۔ سونے کی چمک نے مجھے اندھا کر دیا تھا ۔ نہیں تو اس طرح بلا سوچے سمجھے میں اس جال میں کیسے پھنس جاتا ؟ گرفتاری کے دو گھنٹے بعد مجھے کوٹھری سے باہر لے جایا گیا ۔ ایک لمبے زینے کو پار کرتا ہوا میں ایک بڑے سے ہال میں پہنچا ۔ ہال کے بیچوں بیچ ایک لمبی میز بچھی ہوئی تھی جس پر کالے رنگ کا ایک میز پوش پڑا تھا ۔ میز کے گرد بارہ افراد بیٹھے ہوئے تھے ۔ سب کے سب بوڑھے، سنجیدہ اور بزرگ صورت ۔ ہال میں چاروں طرف جو بنچیں پڑی ہوئی تھیں اُن پر فلورنس کے شہریوں کی بھیڑ جمع تھی ۔ اوپر چھجّوں پر تماشائی ٹھٹھ کے ٹھٹھ کھڑے تھے ۔ اور سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے ۔ جب میں اس میز کے قریب پہنچا تو ایک افسردہ اور ملول صورت شخص نے اپنا چہرہ اوپر اُٹھایا اور مجھ پر نگاہ ڈالی ۔ یہ گورنر تھا ۔ اس نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ وہ مقتولہ کا باپ ہے اس لیے اس مقدمے کی سماعت اور فیصلے میں خود کوئی حصّہ نہ لے

گا۔ اس نے اپنی جگہ، ان بارہ افراد میں سب سے بوڑھے نظر آنے والے شخص کو بٹھا دیا اور وہاں سے اُٹھ گیا۔

اس مرد بزرگ کی عمر کم سے کم نوّے برس رہی ہو گی۔ اس کے کاندھے جھک گئے تھے اور ماتھا سفید بالوں سے ڈھکا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی تھیں اور آواز بہت جمی ہوئی اور کڑک دار تھی۔ میں نے گذارش کی کہ مجھے کچھ بولنے کا موقع دیا جائے۔ اجازت ملنے پر میں نے ساری بات بے کم و کاست کہہ سُنائی۔ جب میں اپنا بیان دے رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ گورنر کا چہرہ کبھی پیلا پڑ جاتا، کبھی لال ہو جاتا۔ میرے چپ ہوتے ہی اس نے گرج کر کہا:

"تم کمینے! تم نے لالچ میں آکر جو جرم کیا ہے اس کی ذمّے داری کسی اور پر کیوں ڈال رہے ہو؟"

اس مرد بزرگ نے جو گورنر کی جگہ پر بیٹھا تھا، اس نے گورنر کو جھڑک دیا کہ اس معاملے میں اپنی زبان نہ کھولے اور کہا کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں نے لالچ میں آکر یہ جرم کیا ہے۔ مقتولہ کے

زیورات تک اس کے جسم پر محفوظ تھے اور
ایک چھلّہ بھی غائب نہیں ہوا تھا۔ اس نے یہ بھی
کہا کہ گورنر قتل سے پہلے کے حالات پر جو اس
کی بیٹی سے متعلق ہوں، جب اچھی طرح روشنی
ڈال چکے گا، تبھی اس مقدمے کا فیصلہ کیا جائے گا۔
پھر اس نے یہ اعلان کیا کہ عدالت اس روز
برخاست کی جاتی ہے کیونکہ مقتولہ کے کچھ خطوط
کا معائنہ بھی کرنا ہے جو ابھی گورنر کی تحویل میں ہیں۔
عدالت اٹھ گئی۔ مجھے پھر اسی کال کوٹھری میں پہنچا
دیا گیا۔ دن بھر میرا ذہن اس اُدھیڑ بُن میں لگا رہا کہ
آخر اس لڑکی اور سرخ لبادے والے میں کیا تعلق تھا؟
دوسرے دن پھر عدالت میں طلبی ہوئی۔ تبھی تیز پر کئی
خطوط رکھے ہوئے تھے۔ اس مرد بزرگ نے مجمع سے
سوال کیا کہ یہ خط میں نے تو نہیں لکھے؟ میں نے ایک
نظر ان رقعوں پر ڈالی اور
اندازہ ہوا کہ جس خط میں
مجھے پیغام موصول ہوا
تھا اسی خط میں یہ رقعے
بھی لکھے گئے ہیں۔
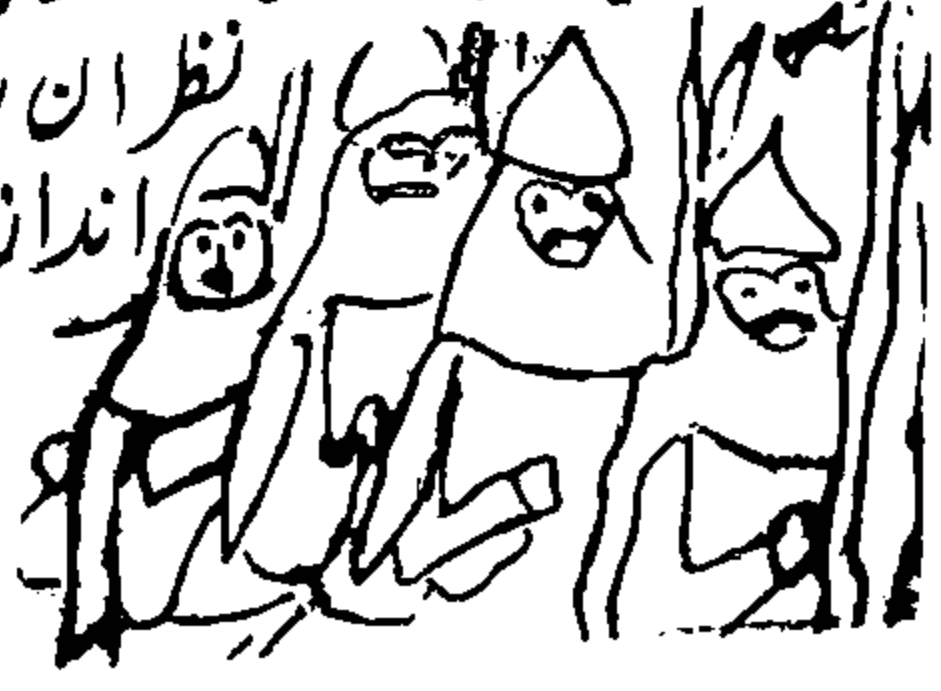
———————— یعنی کہ تحریر ایک ہی شخص کی ہے ۔ میں نے یہی کہہ دیا۔ انھوں نے میری بات نہیں مانی کیونکہ ہر خط کے اخیر میں حرف "ز" لکھا ہوا تھا۔ جو میرے نام کا پہلا حرف ہے۔ ان خطوں میں لڑکی کو دھمکی دی گئی تھی کہ وہ شادی نہ کرے۔ اپنی بات کی دلیل کے طور پر میں نے درخواست کی کہ میرے کمرے میں جو پیغام رکھا ہوا ہے اس کا خط ان رقعوں کے خط سے ملا کر دیکھ لیا جائے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ کمرے کی تلاشی اچھی طرح لی جاچکی ہے اور وہاں کوئی پیغام ہاتھ نہیں لگا ہے۔ آج سارے منصفوں کا رویّہ میری جانب بہت خراب اور سرد مہری کا تھا۔ مقدمے کی کارروائی ختم ہوتے ہوتے میں تمام امیدوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ تیسرے روز جب مجھے پھر عدالت میں لایا گیا تو مجھے بتایا گیا کہ میرا جرم ثابت ہو چکا ہے اور میرے لیے موت کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ تو اب میری زندگی کا خاتمہ ہے؟ میں نے پل بھر کے لیے سوچا۔ بھری جوانی میں، پردیس میں، دوستوں عزیزوں سے دور، یہ کیسی موت ہوگی!

اُسی شام میں اپنی کال کوٹھری میں بیٹھا اپنے

مقدّر کو کوس رہا تھا کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا۔ ایک شخص اندر آیا۔ گھڑی دو گھڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا ــــــ

"زالیوکوس! میں تم سے ملنے آیا ہوں!"

کوٹھڑی نیم تاریک تھی اس لیے میں اُسے پہچان نہ سکا تھا۔ لیکن یہ آواز مجھے جانی پہچانی سی لگی اور میرے ذہن میں یادوں کا ایک دفتر کھل گیا۔ یہ آواز والیتی کی تھی، میرے فرانس کے زمانۂ قیام کا ایک بہت قریبی دوست۔ اس نے بتایا کہ وہ محض اتفاقاً فرانس آ گیا تھا۔ یہاں اس کا پدر جو ایک معزّز آدمی تھا، اُن دِنوں قیام پذیر تھا۔ اس نے شہر میں گھومتے پھرتے اس واقعے کا چرچا سُنا تھا اور چونکہ اس سے میرا نام وابستہ تھا، اس لیے اسے میری فکر ہوئی تھی اور پتا لگاتے وہ یہاں آ پہنچا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اسے ساری بات بلا کچھ چھپائے بتاؤں۔ شاید میری نجات کا کوئی راستہ نکل آئے۔ میں نے قسم کھا کر کہا کہ موت سے پہلے میں جھوٹ بول کر اپنی روح کو داغ دار نہ کروں گا۔ پھر میں نے سارا واقعہ اسے کہہ سُنایا۔

"تو تم اس وقت تک بنا کا کو بالکل نہیں جانتے

تھے ؟" اس نے سوال کیا ۔
میں نے جواب دیا کہ میں نے اُس وقت تک اسے دیکھا بھی نہیں تھا ۔ والیتی نے کہا کہ معاملہ سنگین بھی ہے، پُراسرار بھی ۔ گورنر انتقام کے جوش میں لوگوں سے یہ کہتا پھر رہا ہے کہ میں عرصے سے بنا کا کو جانتا تھا اور میں نے اس کا قتل محض غصّے اور رقابت کی وجہ سے کیا ہے، کیونکہ اس کی شادی دوسرے سے ہونے والی تھی ۔ اس پر میں نے یہ کہا کہ یہ بات اگر صحیح ہو بھی سکتی ہے تو اس سُرخ لبادے والے اجنبی کے سلسلے میں جس نے مجھے اس قتل پر اُکسایا تھا ۔ کچھ دیر بعد والیتی اُٹھ کھڑا ہوا ۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے ۔ اس نے مجھے گلے لگایا اور یہ وعدہ کیا کہ میری جان بچانے کے لیے وہ اپنے بس بھر ہر کوشش کرے گا ۔ مجھے اب کوئی امید تو رہ نہیں گئی تھی لیکن والیتی بہت عقلمند انسان تھا اور قوانین سے بھی اچھی طرح واقف تھا ۔ اس لیے میں نے سوچا کہ شاید کوئی راستہ وہ نکال ہی لے ۔
دو روز تک میں اسی اُلجھن میں گھرا رہا ۔ پھر والیتی دوبارہ ملاقات کے لیے آیا ۔ مجھے سینے سے لگایا اور

اُداس لہجے میں بتایا کہ نجات کا ایک راستہ نکلا ہے، ہر چند کہ یہ راستہ بھی تکلیف دہ ہے۔ مجھے موت کی سزا کے بجائے اب صرف یہ سزا ملے گی کہ میرا ایک ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ اس نے بتایا کہ گورنر اب اس مقدمے کی دوبارہ سماعت پر آمادہ نہیں تھا لیکن ہزار التجاؤں کے بعد اس بات پر تیار ہو گیا کہ اگر اس واقعے کی کوئی اور نظیر مل سکے جس میں سزا موت کی نہ دی گئی ہو تو وہ میری سزا میں بھی تخفیف کی حمایت کرے گا۔ یہ بات گورنر نے صرف اس لیے مان لی تھی کہ وہ ذاتی طور پر اس واقعے سے متعلق تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ فیصلے پر کسی قسم کی نکتہ چینی کی جائے۔ والیتی اور اس کا پدر دونوں رات دن قانون کی کتابیں کھنگالتے رہے۔ آخرکار اُنھیں ایک نظیر مل ہی گئی جس میں عدالت نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ قاتل کو سزائے موت دینے کے بجائے اس کا بایاں ہاتھ قلم کر دیا جائے اور اس کا سارا مال، جائداد وغیرہ ضبط کر لیا جائے۔"

زالیوکوس نے اتنا کہہ کر اُداس نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں تک خاموشی سے کسی

سوچ میں گم رہا پھر دھیمے لہجے میں آگے کا قصّہ شروع کیا — "اے عزیزو! یہ تھا میری ہوس کا انجام۔ میں ذہنی طور پر خود کو اس آزمائش کے لیے تیار کرتا رہا اور اُس لمحے کے بارے میں سوچتا رہا جب ہزاروں تماشائیوں کی موجودگی میں میرا ہاتھ قلم کر دیا جائے گا۔

آخر کار، اے عزیزو! وہ لمحہ آ ہی گیا۔ مجھے اپنی غلطی کا پھل مل گیا۔ میرا ایک ہاتھ کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ زخم بھرنے تک والیئ نے مجھے اپنا مہمان رکھا اور میرے دل بہلاوے کی باتیں کرتا رہا میں نے خون پسینہ ایک کر کے جو دولت کمائی تھی وہ سب کی سب ضبط کر لی گئی۔ اب میری حالت ایک مفلس کی تھی فلورنس سے میں نے سِسلی کی راہ لی۔ پھر وہاں سے قسطنطنیہ۔ اب میری ساری امیدیں اس رقم پر مرکوز تھیں جو میں نے مغرب کے سفر پر روانگی سے پہلے امانت کے طور پر ایک دوست کے پاس رکھوا دی تھی۔ قسطنطنیہ پہنچ کر میں نے اسے اپنی بپتا سنائی۔ پھر اس سے گذارش کی کہ چند روز مجھے اپنے ساتھ قیام کرنے دے۔ ابھی میں تنہائی کے

عذاب سے بچنا چاہتا تھا۔ پھر میرے رہنے کا ٹھکانہ کہاں تھا؟ اور ہوتا بھی تو کیا؟ ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا ہوتا تو بھانت بھانت کے واہمے سر میں سمانے لگتے۔ لیکن عزیزو! میرے اسی دوست نے میری گذارش کے جواب میں اُلٹ کر یہ سوال کیا کہ میں خود اپنے گھر میں قیام کے لیے کیوں نہیں جاتا؟ میں بہت حیران ہوا کہ یہ میرا گھر کہاں سے ٹپک پڑا۔ میری حیرانی پر وہ دوست بھی حیران ہوا اور مجھے بتایا کہ کسی شخص نے ملک یونان کی ایک بستی میں میرے نام ایک مکان خریدا تھا اور اس محلّے کے لوگوں کو یہ خبر دی تھی کہ جلدی ہی میں لوٹ کر آجاؤں گا۔ میں اپنے اس دوست کو ساتھ لے کر مکان دیکھنے کے لیے گیا۔ پڑوسی مجھے پہلے ہی جانتے تھے۔ میری خوب آؤ بھگت کی۔ ایک بوڑھے سوداگر نے ایک خط میرے حوالے کیا جو مکان خریدنے والے اجنبی نے میرے لیے چھوڑا تھا۔

خط کی عبارت یوں تھی کہ "اے زالیوکوس! تمھارا ایک ہاتھ ضائع ہو گیا ہے۔ اس لیے اب میرے دو ہاتھ تمھاری خدمت بجا لائیں گے۔ یہ مکان '

مکان کے اندر کا سارا مال اسباب، سازو سامان سب کچھ تمھارے لیے ہے۔ سال کے سال تمھیں اتنی رقم بھی ملتی رہے گی کہ تم شان سے رئیسوں کی طرح زندگی گزار سکو۔ تم اس شخص کو معاف کر دینا جو تم سے زیادہ بد نصیب اور شکستہ خاطر ہے۔"

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ خط کس کا ہے۔ میرے سوال کے جواب میں اسی سوداگر نے بتایا کہ وہ اجنبی جس نے یہ خط میرے لیے دیا تھا، صورتاً ملک فرانس کا باشندہ نظر آتا تھا اور اس نے ایک سُرخ لبادہ پہن رکھا تھا۔

مکان ستھرا اور کشادہ تھا۔ سامان قیمتی اور رئیسانہ۔ مکان سے ملحق ایک دُکان بھی تھی۔ خوب آراستہ اور دنیا جہان کے سامان سے بھری ہوئی۔ اتنا سامان تو میرے پاس پہلے کبھی نہیں تھا۔

جب سے اب تک دس برس گزر چکے ہیں، آرام اور عزت سے زندگی گزر رہی ہے۔ سفر کا مجھے اب بھی شوق ہے۔ سو اسی شوق کی خاطر کاروبار کو بہانہ بنا کر اب بھی ملکوں ملکوں کی سیر کو جاتا ہوں۔ لیکن اس ملک کی زمین پر میں نے دوبارہ قدم نہیں رکھا جس نے

مجھے اتنا زبردست صدمہ پہنچا یا تھا۔ سال کے سال ایک ہزار اشرفیاں میرے پاس اس اجنبی کی طرف سے آجاتی ہیں اس کی سخاوت اور سلوک سے میرے دل کو تقویت ملتی ہے مگر ذہن پر اُداسی کے بادل جوں کے توں چھائے رہتے ہیں۔ معصوم بنا کا چہرہ آنکھوں میں آٹھوں پہر گھومتا رہتا ہے۔ یہ درد میں اپنے ساتھ قبر تک لے جاؤں گا۔"

زالیوکوس نے اپنا قصہ ختم کیا۔ سب کے سب دھیان سے سُن رہے تھے۔ خاص طور پر وہ اجنبی سوار بہت متاثر دکھائی دیتا تھا اور قصہ سنتے وقت کئی بار اس نے آہ بھری تھی اور آنکھوں سے آنسو پونچھے تھے۔ زالیوکوس کے خاموش ہونے پر بہت دیر تک سب اُنھیں واقعات پر گفتگو کرتے رہے۔

سلیم نے سوال کیا: تمھیں اس اجنبی سے نفرت نہیں محسوس ہوتی جس کے ورغلانے پر تم یہ حرکت کر بیٹھے اور اپنا ہاتھ گنوا بیٹھا؟"

زالیوکوس نے جواب دیا —— "برسوں پہلے تک —— ایسے لمحے بار بار آتے تھے جب میں خدا سے یہ دُعا مانگتا تھا کہ اس اجنبی پر اپنا عذاب نازل کرے۔ لیکن اب میں

نے اپنے دل کو سمجھا لیا ہے۔ میرا مذہب بھی یہی سکھاتا ہے کہ اپنے دشمن سے بھی نفرت نہ کی جائے۔ اب میں اس کے لیے بھی دعائے خیر کرتا ہوں۔ وہ شاید مجھ سے بھی زیادہ دل گرفتہ ہے۔"

"تم کتنے نیک طبیعت انسان ہو!" سلیم نے جذباتی لہجے میں کہا اور محبت سے زالیوکوس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اتنے میں حفاظتی دستے کا کماندار اندر آیا اور یہ تشویشناک خبر لایا کہ اس کے سپاہیوں نے کچھ گھوڑ سوار فاصلے پر دیکھے ہیں جن کا رخ ہماری ہی طرف ہے۔

سارے سوداگر اس خبر سے پریشان ہو گئے کہ اس مقام پر اکثر قافلے لوٹ لیے جاتے تھے۔ البتہ سلیم کو ان کی پریشانی پر کچھ حیرت ہوئی اور اس نے کہا کہ ہم سب محفوظ رہیں گے اور لٹیرے ہمارا بال بھی بیکا نہ کریں گے۔

یہ سُن کر کماندار بولا ـــــ "لٹیرے اگر معمولی قسم کے ہوئے تو ہم محفوظ رہیں گے لیکن ـــــ خدانخواستہ اگر اس علاقے کے سب سے بدنام ڈاکو اربذان سے سابقہ پڑ گیا تو مصیبت آ جائے گی۔"

"آخر اربذان کی کیا بساط ہے؟ تم سب اس سے اتنے خوفزدہ کیوں ہو؟ سلیم نے پوچھا۔"

سب سے بوڑھے سوداگر احمد نے جواب دیا ـــ

"اربذان کے بارے میں ہزاروں کہانیاں ان علاقوں میں گشت کرتی ہیں۔ کچھ لوگ اسے پُراسرار غیبی قوتوں کا مالک سمجھتے ہیں۔ وہ اکیلا پانچ جوانوں پر بھاری پڑتا ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ فرانس کا باشندہ ہے اور اس کی تقدیر اُسے یہاں کھینچ لائی ہے۔ خیر، کچھ بھی ہو۔ وہ ہے بہت خطرناک!"

"نہیں! ایسا نہیں ہے" ایک اور سوداگر نے

جس کا نام لیزہ تھا، احمد کی بات کاٹتے ہوئے کہا:
"اس میں شک نہیں کہ اربذان ڈاکو ہے لیکن اس میں نیکی بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے قبیلے میں لوگ اس کی بہت عزّت کرتے ہیں۔ اربذان ڈاکے نہیں ڈالتا بلکہ قافلے والوں سے اپنا خراج وصول کرتا ہے اور جس نے بھی خراج دے دیا وہ ساتھ خیریت کے آگے کا سفر کرتا ہے۔ اسے اربذان کا تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ پھر کسی اور کی کیا ہمّت کہ اس قافلے کو تنگ کرے۔ اربذان صحرا کا بادشاہ ہے۔"

سوداگر اپنے خیمے میں بیٹھے اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ لیکن باہر محافظ دستے کے لوگ خاصے پریشان تھے۔ مسلح سواروں کا دستہ اور قریب آتا جا رہا تھا۔ جب سوداگروں کو اس کی خبر دی گئی تو ان میں یہ بحث شروع ہو گئی کہ وہ جم کر آنے والوں سے مقابلہ کریں یا اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیں اور چپ چاپ بیٹھے رہیں۔ احمد اور دو بوڑھے سوداگر مقابلے کے حق میں نہیں تھے۔ مگر ملیح اور زابوکوس جن کا لہو گرم تھا، آنے والوں سے ٹکر لینے پر آمادہ تھے۔ انھوں نے سلیم کو بھی دعوت

دی کہ ان کے ساتھ وہ بھی باہر جائے اور اپنی شجاعت کا ہاتھ دکھائے ۔

سلیم نے جواب میں اپنی کمر پٹی کے نیچے سے ایک نیلا رومال نکالا جس پر سرخ ستارے کڑھے ہوئے تھے۔ پھر وہ رومال اس عزیز نے ایک نیزے کے سرے پر باندھ دیا اور غلاموں کو ہدایت دی کہ نیزہ لے جا کر خیمے کے باہر گاڑ دیں ۔ اس نے بڑے دعوے کے ساتھ کہا کہ آنے والے سوار جب رومال لہراتے ہوئے نیزے کو دیکھیں گے تو چُپ چاپ کسی اور سمت نکل جائیں گے ۔ حملے کی خاطر ہرگز نہ آئیں گے ۔ کچھ کو اس بات پر یقین آیا، کچھ کو یہ بات خالی خولی ڈینگ لگی۔ سب آنے والے لمحے کے منتظر تھے ۔ پھر وہی ہوا جس کا سلیم نے یقین دلایا تھا۔ مسلح سواروں نے جونہی خیمے سے باہر گڑے نیزے اور اس پر لہراتے رومال کی جانب دیکھا ڈم دبائے آگے بڑھ گئے ۔

سوداگروں کو جانے والوں پر بھی حیرانی ہوئی اور سلیم پر بھی ۔ سلیم خاموش کھڑا تھا ۔ گویا کہ کوئی خاص بات ہی نہیں ۔ اس کی نگاہ دور افق پر جمی ہوئی تھی ۔ آخر کو ملیح نے خاموشی توڑی اور یوں گویا ہوا :

"اے اجنبی! تم کون ہو؟ یہ کیا اسرار ہے؟"

"یا رفقا!" سلیم نے ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں کیا بھید ہے، خود مجھے معلوم نہیں۔ میں نے یہ رومال اپنی قید کے دوران حاصل کیا تھا۔ مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ اگر کوئی اس نشان کے ساتھ سفر کرے تو ہر خطرے سے محفوظ رہتا ہے۔"

سوداگروں نے سلیم کا شکریہ ادا کیا۔ مسلح سوداگروں کا دستہ اتنے افراد پر مشتمل تھا کہ اگر وہ حملہ کر بیٹھتے تو جان بچانا محال ہو جاتا۔ یہ خطرہ ٹلنے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے تھے، اور اب ہر فکر سے ان کا ذہن آزاد تھا۔ ہوا میں اب خنکی پیدا ہو چکی تھی۔ شام دھیرے دھیرے گہری ہوتی جاتی تھی۔ صحرا پُرسکون دکھائی دیتا تھا۔ وہ آگے سفر پر چل پڑے۔

اگلے روز جب انھوں نے ایک نئی منزل پر پڑاؤ ڈالا تو انھوں نے یہ اندازہ لگایا کہ اب صحرا کا سفر بس ایک دن کا اور رہ گیا ہے۔ کھا پی کر سب ایک جگہ بیٹھے تو یزہ نے کہا:

"عزیزو! کل میں نے کہا تھا کہ اربذان ایک بھلا آدمی ہے۔ اس کے ثبوت میں کچھ واقعات سناتا ہوں

جو میرے بھائی کو پیش آئے تھے ۔
سب کے سب لیزہ کے قریب سمٹ آئے اور
اس کی آواز پر کان لگا دیے ۔ لیزہ نے ایک لمحے کے

توقّف کے بعد ان واقعات کا بیان اس طرح شروع کیا ـــــ "اقرہ کے مقام پر ہمارا خاندان رہتا تھا ۔ میرے والد قاضی تھے ۔ ان کے تین اولادیں تھیں ۔ ان میں سب سے بڑا میں تھا ۔ مجھ سے چھوٹا ایک بھائی تھا اور ایک بہن ۔ جب میں نے عمر کے بیس برس پورے کیے تو ایک روز میرے چچا نے مجھے بلایا اور بتایا کہ انھوں نے اپنی تمام املاک اور جائداد کا وارث مجھے مقرّر کر دیا ہے ۔ بس ایک شرط ہے ۔ یہ کہ جب تک وہ زندہ رہیں میں انھیں کے ساتھ قیام کروں ۔ میرے چچا نے ایک لمبی عمر پائی ۔ سو اپنے گھر میں بس دو ہی برس پہلے واپس آیا ہوں ۔ گھر آنے تک مجھے کچھ خبر اس بات کی نہ ہو سکی تھی کہ میری عدم موجودگی میں ہمارے خاندان پر کیا مصیبتیں آئیں اور خدائے بزرگ و برتر نے بالآخر کس طرح مصیبتوں کے اس جال سے میرے خاندان کو نجات دلائی ۔ عزیزو ! اللہ بڑا کارساز ہے اور قدرت کے کارخانے میں کسی اور کی کیا مجال کہ ایک پتّہ بھی بغیر اس کے حکم کے ہل سکے ۔ سو اے عزیزو ! سنو اور غور کرو ـــــ"

۴۵

میرے بھائی مصطفیٰ اور بہن فاطمہ کی عمروں میں تھوڑا ہی فرق تھا، بس دو برس کا۔ مصطفیٰ سے فاطمہ دو سال چھوٹی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت پیار کرتے تھے۔ والد انھیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے۔ جب فاطمہ سولہ برس کی عمر کو پہنچی تو مصطفیٰ نے اُس کی سالگرہ کا جشن منانے کا ارادہ کیا۔ اُس نے فاطمہ کی تمام سہیلیوں کو دعوت نامے بھیجے اور والد کی حویلی کے باغ میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔ شام کو کشتی پر دریا کی سَیر کا اہتمام کیا گیا۔

فاطمہ اور اس کی سہیلیاں بے حد خوش تھیں۔

وہ شام بہت خوش گوا ر تھی۔ سمندر کے ساحل سے شہر کا منظر بے حد حسین تھا۔ لڑکیاں آپس میں خوب چہلیں کر رہی تھیں۔ انھوں نے مصطفے سے فرمایش کی کہ سیر ذرا لمبی ہونی چاہیے۔ مصطفےٰ نے قدرے جھجک کے ساتھ اُن کی بات مانی کیونکہ چند روز قبل ہی سمندر میں بحری قزاقوں کا ایک جہاز نظر آیا تھا۔
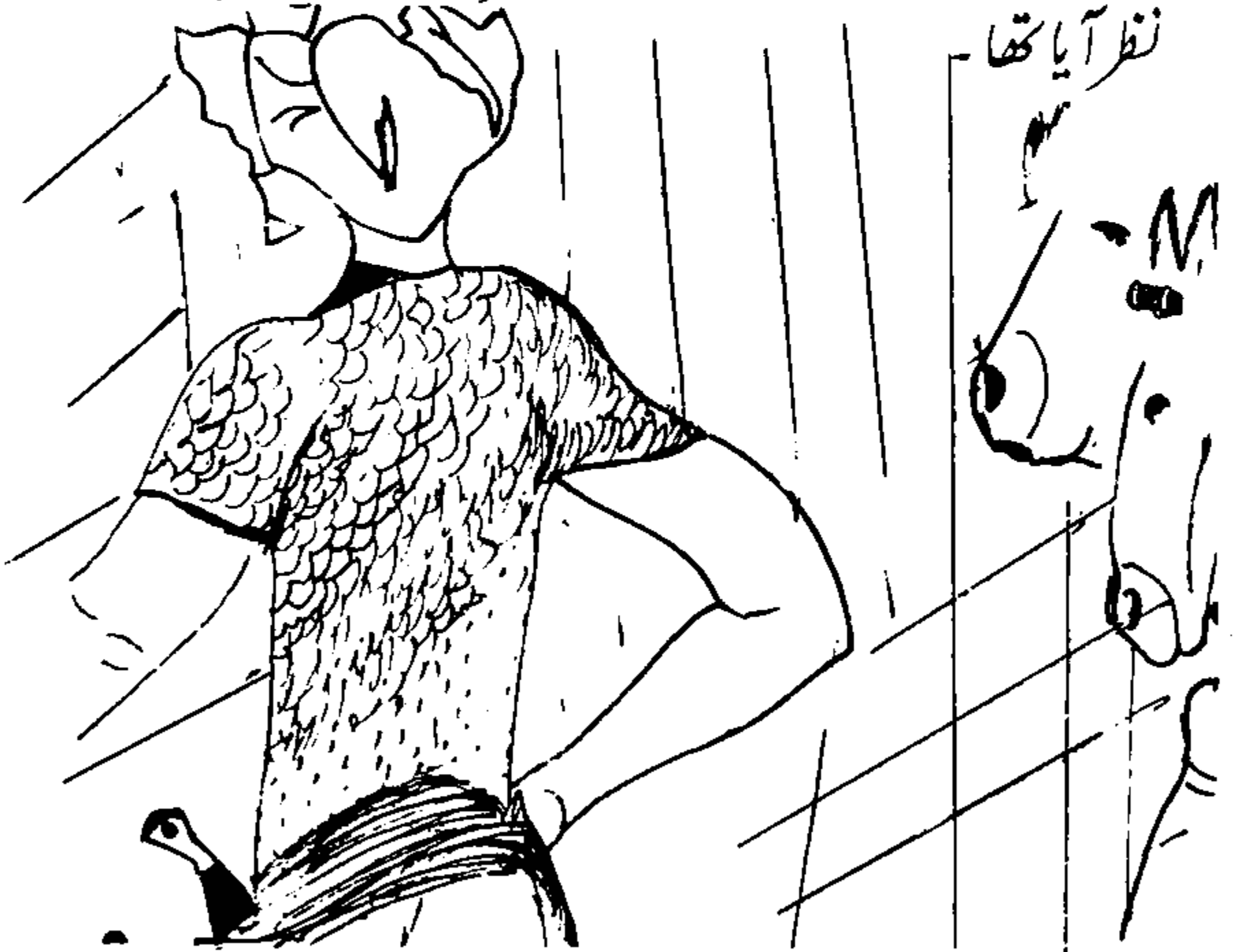
لڑکیوں کے اصرار پر کشتی کنارے سے ذرا فاصلے پر چلی گئی تھی۔ اتنے میں تھوڑی ہی دور پر ایک اور کشتی دکھائی دی۔

اس پر مسلح جوان سوار تھے۔ مصطفیٰ نے فوراً خطرے کی بُو سونگھ لی اور کشتی بانوں کو حکم دیا کہ فوراً اس کا رُخ ساحل کی طرف موڑ لیں اور جتنی جلد ممکن ہو وہاں سے نکل چلیں۔ لیکن دوسری کشتی والے بھی چوکنے تھے۔ انھوں نے تعاقب کیا اور آن کی آن میں قریب آ پہنچے۔

لڑکیوں نے جب خطرہ سَر پر دیکھا تو گریہ وزاری کرنے لگیں۔ مصطفیٰ نے اُنھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ڈر تھا کہ کہیں وہ سب کی سب حواس کھو بیٹھیں اور کشتی اُلٹ گئی تو سب کے سب ان سے جائیں گے
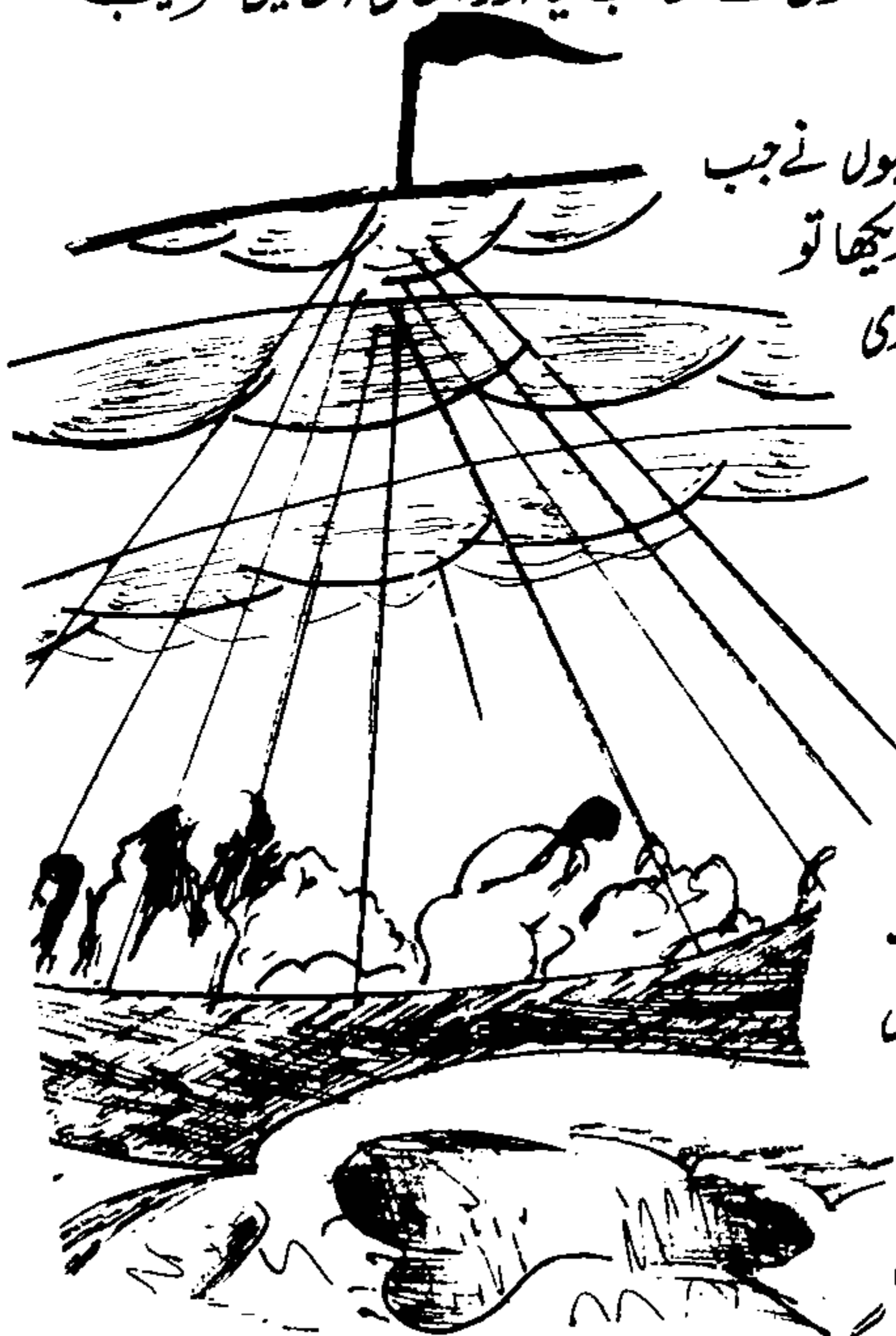
لیکن ہر فہمایش بیکار ثابت ہوئی ۔ جیسے ہی مسلّح جوانوں کی بڑی سی کشتی کچھ اور نزدیک آئی لڑکیاں سہم کر ایک دوسرے سے چمٹ گئیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشتی اُلٹ گئی ۔ ٹھیک اسی وقت ساحل پر ایک عجیب و غریب جہاز دکھائی دیا ۔ شاید اس جہاز پر جو لوگ سوار تھے اُن کی نظر ان لوگوں پر پڑ گئی تھی ۔ چھوٹی چھوٹی کئی کشتیاں لڑکیوں کو بچانے کے لیے جہاز والوں نے روانہ کر دیں ۔ پل بھر میں وہ کشتیاں اس مقام پر آپہنچیں اور ڈوبتی ہوئی لڑکیوں کو بچا لیا گیا ۔ اے رفیقو ! قیامت کا سماں تھا ۔ کسی کے حواس قابو میں نہ تھے ۔ جب لڑکیوں کا شمار کیا گیا تو پتا چلا کہ میری بہن فاطمہ اور اس کی ایک سہیلی لا پتہ ہیں ۔ مسلّح جوانوں کی کشتی بھی غائب ہو چکی تھی اور دُور دُور اس کا سراغ نہ ملتا تھا ایک اجنبی بھی اُنھیں لڑکیوں کے پیچھے دکھائی دیا ۔ مصطفےٰ نے ڈانٹ ڈپٹ کی تو اس ناہنجار نے یہ بات قبول لی کہ وہ لٹیروں کا ساتھی ہے ۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے ساتھی دو لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے گئے ۔

میرے والد کو سخت صدمہ پہنچا ۔ ڈر تھا کہ کہیں اس صدمے کے اثر سے جاں بحق نہ ہو جائیں ۔ ادھر مصطفےٰ کی حالت خراب تھی ۔ ایک تو بہن کے کھو جانے کا غم ، پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی نگرانی میں

یہ سب کچھ ہوا تھا۔ اپنے آپ پر
اسے شرم آتی تھی۔ فاطمہ کی جو
سہیلی اس کے ساتھ غائب
ہوئی تھی وہ مصطفیٰ کو
بہت عزیز تھی۔
سو اس کا دُکھ
دوگنا تھا۔ گرچہ
یہ بات اس نے
اب تک خاندان کے
تمام لوگوں سے چھپائی
تھی اور اے عزیزو!
اس کا سبب یہ تھا کہ
وہ لڑکی ایک معمولی
خاندان سے تعلق
رکھتی تھی اور ہماری
حیثیت کی نہ تھی۔ ہمارے
والد سخت گیر آدمی تھے۔ اس رشتے پر کبھی بھی رضامند
نہ ہوئے۔
اس سانحے کے چند روز بعد والد نے مصطفیٰ کو بلایا۔

چند لمحوں تک کڑی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر برس پڑے ——— "نالائق! تمھاری ہی غیر ذمّے داری نے یہ دن دکھایا ہے۔ میری آنکھوں کا نور، دل کا چین چلا گیا۔ آہ! میری پیاری دختر خدا جانے کس حال میں ہوگی۔ جاؤ! چلے جاؤ! اب اس گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لیے بند کر دیے گئے ہیں۔ میں تمھیں بد دعا دیتا ہوں کہ جیسی تکلیف اس بڑھاپے میں تمھاری حماقت سے مجھ کو پہنچی ہے اس سے سوا تکلیف تم کو پہنچے۔ تم پر لعنت ہو!"

میرے غریب بھائی کو والد سے اتنی سختی کی توقع نہ تھی۔ اس نے خود ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ فاطمہ کی تلاش میں جائے گا اور کسی نہ کسی طرح اسے ڈھونڈ کر لائے گا۔ لیکن ——— والد نے تو اسے گھر سے ہی نکال دیا۔ اس کا دل ٹوٹ گیا۔ پھر ——— اس نے یہ عہد کیا کہ جیسے بھی ہوسکا وہ دونوں لڑکیوں کو واپس لا کر دم لے گا۔

وہ اس لٹیرے کے پاس گیا جسے قید کر لیا گیا تھا اور اس سے پوچھا کہ لٹیروں کے جہاز کو کس طرف تلاش کیا جائے۔ پتا چلا کہ وہ لٹیرے غلاموں اور کنیزوں کا کاروبار کرتے تھے۔ اور عام طور پر بلزورا کے ساحلی شہر میں جو بڑا بازار لگتا تھا، اس میں وہ غلاموں اور کنیزوں کو فروخت کرتے تھے۔

۵۱

مصطفیٰ نے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ والد کا غصّہ کچھ کم ہو گیا تھا۔ سو انھوں نے مصطفیٰ کو اشرفیوں سے بھری ایک تھیلی دی۔ مصطفیٰ نے بہ چشمِ نم سب سے رخصت لی اور اپنی مہم پر نکل گیا۔

اس نے خشکی کا سفر اختیار کیا کیونکہ ہمارے شہر سے بلزورا تک کوئی جہاز جاتا نہ تھا۔

وہ روزانہ خاصی لمبی مسافت طے کرتا۔ اس کا گھوڑا قوی اور جی دار تھا۔ پھر اس نے سامان بھی بہت ہلکا ساتھ لیا تھا۔ اسے امید تھی کہ چھٹے دن کے خاتمے تک وہ اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔
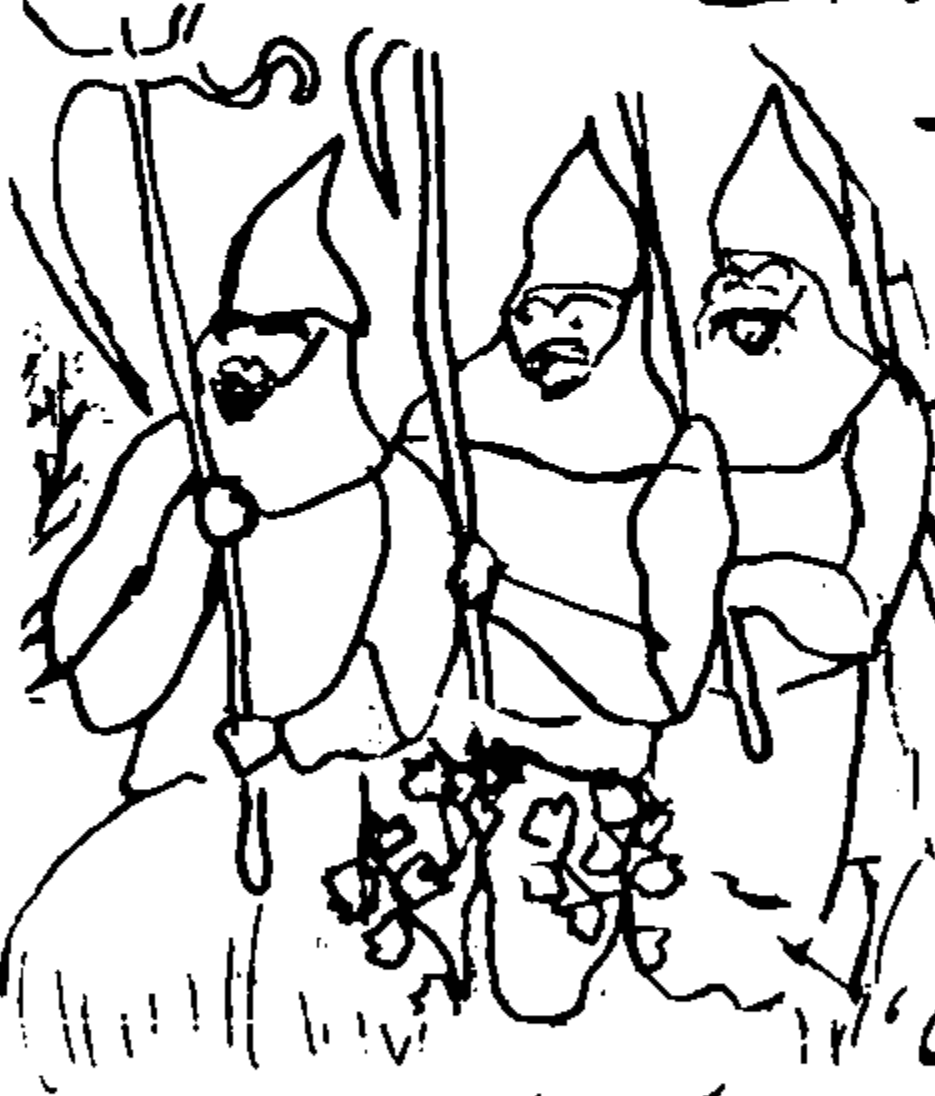
لیکن سفر کے چوتھے دن، وہ ایک سنسان راستے سے گزر رہا تھا کہ تین آدمی ہتھیاروں سے لیس اور خونخوار صورتوں والے اچانک کہیں سے نمودار ہوئے اور اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ مصطفیٰ نے ناچار گھوڑا اور اشرفیوں کی تھیلی اُن کے حوالے کر دی۔ ان ظالموں نے اسی پر بس نہ کیا۔ انھوں نے مصطفیٰ کو گھوڑے کے پیٹھ

کے ساتھ رسیوں سے باندھ دیا اور اسے لے کر چمپت ہو گئے۔ مصطفےٰ کی فریادوں کا ان سنگ دلوں پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔

اب کیا امید باقی رہ گئی تھی؟ مصطفےٰ کو دُنیا تاریک نظر آنے لگی۔ تن بہ تقدیر وہ اُن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ گھنٹے بھر بعد وہ لوگ ایک تنگ وادی میں داخل ہوئے۔ وادی کے دونوں طرف قدآور درخت تھے۔ نیچے ہری ملائم گھاس۔ پاس ہی ایک تیز رو چشمہ تھا۔ اس راہ سے گزرنے والے آدمی جانور سبھی اس چشمے کے پانی سے پیاس بجھاتے اور گھڑی دو گھڑی وہاں قیام کرتے۔ ان ظالموں نے بھی اس پر فضا مقام پر پہنچتے ہی گھوڑوں کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی اور اُتر پڑے۔ آس پاس کچھ خیمے نصب تھے۔ ایک خیمے سے بیک وقت دو گانے والوں کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ کوئی دَف بھی بجاتا جا رہا تھا۔ ان ظالموں نے مصطفےٰ پر رحم کیا اور اس کے بدن سے رسی کھول دی۔ پھر اسے حکم دیا کہ سب سے بڑے خیمے میں داخل ہو جائے۔

۵۳

خیمے کے اندر کے منظر کا حال کیا بتاؤں؟ بس یہ سمجھ لو کہ
کسی رئیس ابن رئیس ابن رئیس کا دیوان خانہ نظر آتا تھا۔
منقش اور مزین مسندیں اور بیش قیمت قالین، سونے
چاندی کے ظروف۔ ایک پستہ قامت بوڑھا بیٹھا تھا۔ کالی'
مٹیالی جلد، کینہ توز آنکھیں اور سخت گیر دہانہ۔ وہ مردود بوڑھا
چہرے سے کم ذات لگتا تھا اور اسے دیکھ کر کسی کو بھی اس
نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہ لگتی کہ اس کے اِرد گِرد جو قسم قسم کی
قیمتی چیزیں بکھری تھیں، وہ صرف لوٹ مار کے نتیجے میں ہاتھ آئی
ہوں گی۔

اس نے چہرے پر مصنوعی رعب طاری کرتے ہوئے
کھنکھناتی ہوئی آواز میں کہا ــــــ "بیٹھ جاؤ!"
اجنبی نے جو مصطفیٰ کو ساتھ لے کر خیمے میں داخل ہوا تھا'
لاپروائی کے انداز میں سوال کیا ــــــ "سردار کہاں ہے؟"
"شکار پر گیا ہوا ہے!" بوڑھے نے جواب دیا۔ پھر بولا ــــــ
"اس وقت میں ہی اس کا نائب ہوں!"
"ہوں!" اجنبی نے پرخیال انداز میں کہا ــــــ "اب یہ
طے کرنا ہے کہ اس کتے کو جان سے مار دیا جائے یا نہیں۔ سردار ہی
فیصلہ کرے گا سمجھے میاں حسن!" اتنا کہہ کر وہ بوڑھے کی
طرف تمسخر آمیز انداز میں دیکھنے لگا۔

بوڑھا غصّے میں کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے لپک کر اجنبی کے کان کھینچنے چاہے لیکن اجنبی سرو قامت تھا اور بوڑھا پستہ قد اس لیے اجنبی کے کان اس کی دست رس سے محفوظ رہے۔ اجنبی ہنسنے لگا۔ بوڑھے پر جھنجھلاہٹ سوار ہو گئی اور وہ مغلّظات بکنے لگا۔

اچانک خیمے کا پردہ اُٹھا اور ایک لمبا تڑنگا نوجوان، خوبرو اور پُرشکوہ اندر آیا۔ صورت سے عجمی شہزادہ لگتا تھا۔ اس کا لباس اور اسلحے معمولی تھے۔ بس خنجر بہت قیمتی دکھائی دیتا تھا۔ دستے پر ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ لیکن انداز و اطوار شاہانہ تھا۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ میرے خیمے میں تمھاری یہ مجال!" اس نے گرج کر کہا۔

بوڑھا کانپ گیا۔ لمحے بھر کے لیے خیمے میں سنّاٹا چھا گیا۔
"حسن! میں نے تمھیں نائب مقرّر کیا تھا! کیوں؟" نوجوان نے غصیلی نظروں سے بوڑھے کو دیکھتے ہوے سوال کیا۔

بوڑھے نے بزدلوں کے انداز میں سر جھکا لیا۔ اس کا قد کچھ اور کم دکھائی دینے لگا۔ پھر نوجوان نے اسے ایک لات رسید کی اور لڑھک کر وہ خیمے کے باہر جا پڑا۔

اب اس اجنبی نے نوجوان کو مخاطب کیا —— "سردار! یہ قیدی تمھارے حکم پر گرفتار کر لیا گیا تھا۔ حاضر ہے!"

۵۵

نوجوان نے سر سے پیر تک مصطفیٰ پر ایک چھلکتی ہوئی نظر ڈالی اور کہا — "پاشا! تمھیں معلوم ہے کہ تم کس لیے اربذان کے سامنے لائے گئے ہو!"

"اربذان" کا نام سنتے ہی مصطفیٰ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ وہ اس کے قدموں میں گر پڑا اور گریہ کرنے لگا۔ "میں نہ پاشا ہوں نہ شہزادہ! میں تو ایک معمولی آدمی ہوں۔ ایک بدنصیب آدمی!" مصطفیٰ نے گڑگڑا کر کہا۔

اربذان کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ آنکھوں سے بے یقینی جھلکنے لگی۔ پل بھر وہ چپ رہا۔ پھر کڑک کر بولا — "جھوٹ بولنے سے کام نہیں چلے گا سمجھے؟ میں کسی ایسے شخص کو لاؤں گا جو تمھیں پہچانتا ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے تالی بجائی۔ ایک خادم اندر آیا۔ نوجوان نے اسے حکم دیا کہ زلیما کو حاضر کرے۔ چند لمحوں بعد ایک بڑھیا بھوس اندر آئی۔

اربذان نے میرے بھائی کی طرف انگلی اُٹھاتے ہوئے کہا — "یہی سلیج کا پاشا ہے؟" اس کمبخت بڑھیا نے منمنا کر جواب دیا — "ہاں یہی ہے!"

اس پر اربذان چیخ پڑا — "جھوٹے! فریبی! تم سمجھ رہے تھے کہ اس طرح آنکھوں میں دھول جھونک کر بچ نکلو گے؟

تم اتنے غلیظ ہو کہ میں اپنے خنجر کی نوک پر تمھارے لہو کی بوند دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گا! کل صبح تمھیں رسیوں میں جکڑ کر گھوڑے کی دُم سے لٹکا دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد تمھیں اس وقت تک جنگل میں گھسیٹا جائے گا' جب تک کہ سلیج کی پہاڑیوں کے پیچھے سورج غروب نہ ہو جائے۔"

میرے بھائی کا خون خشک ہو گیا۔ اس نے روتے ہوئے کہا —— "یہ سب میرے والد کی بد دعاؤں کا اثر ہے۔ میرے خدا! یہ کن گناہوں کی سزا ہے!"

"تم میرے سامنے فرضی کہانیاں نہ سُناؤ! سمجھے!" اربذان بولا۔

اس اجنبی نے جو چپ چاپ کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا' دھیرے سے کہا —— "سردار کے قہر سے ڈرو! جاؤ اور اگر چاہو تو رات عبادت میں گزار دو! جاؤ' باہر نکلو!"

مصطفٰے کے قدم دروازے کی طرف اُٹھے ہی تھے کہ سردار کے گروہ کے تین اور افراد ایک قیدی کو ساتھ لیے اندر آئے۔ ایک نے پرجوش انداز میں کہا "سردار! یہ لو پاشا حاضر ہے!"

میرے بھائی نے ٹھٹک کر اس قیدی کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دونوں کی صورتیں تقریباً

۵۷

ایک جیسی تھیں۔ بس اتنا فرق تھا کہ اس قیدی کی جلد کا رنگ قدرے سانولا تھا اور مصطفیٰ کی داڑھی اس کے مقابلے میں زیادہ سیاہ اور چمکیلی تھی، اربذان بھی دونوں کی مماثلت پر حیران ہوا۔

"تم دونوں میں اصل آدمی کون ہے، میرا مطلب ہے سلیج کا پاشا؟" اربذان نے یکے بعد دیگرے دونوں کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"میں ہوں!" قیدی نے پرغرور انداز میں جواب دیا۔

اربذان نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا پھر محافظوں کو اشارہ کیا کہ اسے لے جائیں۔ اس کے بعد وہ میرے بھائی کی طرف مڑا۔ اپنے خنجر سے اس کی رسیاں کاٹیں۔ پھر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔

"اجنبی!" وہ بھاری آواز میں بولا "میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ محض غلط فہمی کی بنا پر تمھیں یہ زحمت اٹھانی پڑی۔ اسے تقدیر کا کھیل سمجھو اور عفو سے کام لو۔"

میرے بھائی نے بس یہ درخواست کی کہ اسے اپنا سفر جاری رکھنے کی اجازت دے دی جائے۔ اس کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اربذان نے اس جلد بازی کا سبب پوچھا۔ مصطفیٰ نے ساری بپتا کہہ سنائی۔ اس پر اربذان نے اصرار کیا کہ

وہ ایک رات اس کا مہمان رہے اور آرام کرے۔ اس نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ اسے بلزورا کا ایک نسبتاً مختصر راستہ بتائے گا۔ میرے بھائی نے اس کی درخواست قبول کرلی۔ اربذان نے اس کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ عمدہ کھانے تیار کروائے۔ آرام دہ بستر لگوا دیا۔ وہ رات مصطفیٰ نے بہت آرام سے گزاری اور جی بھر کے اچھی گہری نیند کے مزے لیے۔

"آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ خیمے میں وہ اکیلا ہے۔ پردے کے دوسری طرف سے اربذان اور حسن کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ چپ چاپ ذرا دیر سنتا رہا۔ حسن اربذان سے اصرار کر رہا تھا کہ اس اجنبی کو جو گرفتار کر کے لایا گیا ہے جان سے مار دیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بعد میں خطرناک ثابت ہو۔" یہ طے تھا کہ حسن کو مصطفیٰ سے ایک قسم کی ذاتی پرخاش ہو گئی تھی۔ مصطفیٰ ہی کی وجہ سے اسے اتنی رسوائی اٹھانی پڑی تھی۔ میرے بھائی کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون پل بھر کے لیے جم سا گیا۔ پھر اربذان کی آواز گونجی اور اس کی جان میں جان آئی۔ اربذان کہہ رہا تھا۔ "نہیں! یہ اجنبی ہمارا مہمان ہے۔ اور مہمان کی جان لینا اربذان کے اصول کے خلاف ہے۔ پھر مجھے یقین ہے کہ اس سے ہمیں کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔"

چند لمحوں بعد اربذان خیمے میں داخل ہوا اور نرم لہجے میں

کہا: "کیوں مصطفیٰ! کیسے ہو تم؟ ہم اب سفر کے لیے تازہ دم ہو جائیں!"

اس نے مصطفیٰ کی طرف شربت کا ایک گلاس بڑھایا۔ شربت ختم کرنے کے بعد دونوں باہر نکلے۔ دو گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ رکاب پر پانو رکھتے ہی مصطفیٰ کے حوصلے اونچے ہو گئے۔ دونوں نے ایڑ لگائی اور یہ جا وہ جا۔ سامنے گہرا گھنا جنگل تھا اور اس کے بیچوں بیچ ایک صاف ستھرا چوڑا راستہ۔ سفر کے دوران اربذان نے مصطفیٰ کو بتلایا کہ سلیج کے پاشا نے کس طرح اس کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے۔ پہلے تو اس نے یہ یقین دلایا تھا کہ وہ اس کے آدمیوں کی نقل و حرکت پر معترض نہ ہوگا۔ لیکن پھر اس کے ایک آدمی کو گرفتار کر کے اذیتیں دیں اور بالآخر اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ جب سے اب تک اربذان کے آدمی پاشا کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور موقعے کی تاک میں تھے۔ اب وہ ہاتھ آ گیا تھا اور اربذان کے ہاتھوں اس کی موت یقینی تھی۔

جنگل کے مشرقی کنارے پر پہنچنے کے بعد اربذان نے اپنا گھوڑا روک لیا۔ مصطفیٰ کو آگے کا راستہ سمجھایا اور خدا حافظ کہنے سے پہلے یوں گویا ہوا: "اے مصطفیٰ! تم عجیب و غریب حالات میں اربذان کے مہمان بنے۔ تم نے ناحق اتنی تکلیفیں اٹھائیں۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ یہ خنجر بس تمھیں اپنی نشانی

کے طور پر دیتا ہوں۔ جب کبھی تم پر کوئی بُرا وقت پڑے تم یہ خنجر کسی طرح مجھ تک بھیج دینا۔ میں تمھاری مدد کو آجاؤں گا۔ اور اشرفیوں کی یہ تھیلی بھی سنبھالو! یہ تمھارے سفر کے اخراجات کے لیے ہے۔"

میرے بھائی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے خنجر تو لے لیا لیکن اشرفیوں کی تھیلی اسے واپس کرنی چاہی۔ اربذان نے مزید اصرار کیا۔ پھر وہ تھیلی وہیں چھوڑ کر رفوچکّر ہوگیا۔ مصطفیٰ نے بالآخر وہ تھیلی اُٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی۔ خدا کا شکر ادا کیا اور بلزورا کی جانب روانہ ہوگیا۔

کہانی کے اس موڑ پر پہنچ کر لیزہ نے پل بھر کو خموشی اختیار کی اور سوالیہ نظروں سے احمد کی طرف دیکھا۔ احمد نے کہا "اگر یہ صحیح ہے تو میں اربذان کے سلسلے میں اپنی رائے بدل کیے لیتا ہوں! وہ تو واقعی بھلا آدمی ہے اور تمھارے بھائی کے ساتھ اس نے بڑی نیکی کا سلوک کیا ہے۔"

— بلیج نے کہا: اس کا برتاؤ ایک سچے مسلمان کا برتاؤ ہے۔ خیر! اب آگے کا احوال سُناؤ۔"

لیزہ نے جواب دیا — "اگر آپ لوگ اُکتا نہیں گئے ہیں تو میں باقی قصّہ بھی سُناؤں گا۔ یہ واردات بہت انوکھی اور دل چسپ ہے۔"

سب نے لیزہ کی آواز پر کان لگا دیے اور لیزہ نے آگے کے واقعے کا بیان شروع کیا:

"گھر چھوڑنے کے ساتویں دن کی صبح کو مصطفےٰ بلزورا کی فصیل کے سامنے تھا۔ ایک سرائے کے پاس پہنچ کر وہ گھوڑے سے اُترا۔ ایک راہ گیر سے دریافت کیا کہ غلاموں کا بازار وہاں کس روز لگتا ہے، اور اسے یہ سن کر مایوسی ہوئی کہ وہ دو دن دیر سے وہاں پہنچا تھا۔ راہ گیر نے اسے پچھلے بازار کا احوال سُنایا اور بتایا کہ دو بہت خوبصورت کنیزیں اُس روز فروخت ہوئیں۔ تفصیلات معلوم ہونے پر مصطفےٰ کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ کنیزیں فاطمہ اور اس کی سہیلی زریدہ تھیں جس شخص نے انھیں خریدا اس کا نام سیولیکوس تھا اور بلزورا سے اس کے وطن کا راستہ کم از کم چالیس گھنٹوں کا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا صاحبِ حیثیت شخص تھا اور اب کافی روپیا پیسہ جمع کرنے کے بعد چین کی زندگی گزار رہا تھا۔

مصطفےٰ نے پہلے تو یہ ارادہ کیا کہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر وہ اُسی وقت سیولیکوس کے وطن کی راہ لے۔ پھر اسے خیال آیا کہ تنِ تنہا اتنے صاحبِ حیثیت شخص سے نبٹنا اس کے بس کی بات نہ ہو گی۔ کافی غور و خوض کے بعد اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی ـــــ یہ کہ وہ سلیج کے پاشا کی حیثیت

میں اس سے ملے۔ مصطفیٰ نے اپنے بالوں اور داڑھی پر سلیج کے پاشا کے بالوں جیسی رنگت والا خضاب لگایا۔ ایک جڑی بوٹی پیس کر اس کا لیپ بنایا اور چہرے پر ملا۔ اب اس کی جلد کا رنگ کچھ گندمی ہو گیا تھا اور وہ عین مین سلیج کا پاشا لگتا تھا۔ اس نے ایک خدمت گار سیولیکوس کے محل کی طرف روانہ کیا، اس پیغام کے ساتھ کہ وہ ایک رات اس کے گھر قیام کا طالب ہے۔ سیولیکوس نے غلاموں کا ایک پورا دستہ اس کے خیر مقدم کے لیے بھیج دیا۔ وہ بڑے اکرام کے ساتھ مصطفیٰ کو اپنے ساتھ لے گئے۔

سیولیکوس نے مصطفیٰ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑی عزت سے پیش آیا۔ خوب عمدہ عمدہ کھانوں سے اس کی تواضع کی۔ کھانے سے فراغت کے بعد گفتگو کا سلسلہ چل نکلا اور باتوں باتوں میں سیولیکوس اپنی نئی کنیزوں کا تذکرہ کر بیٹھا۔ سیولیکوس نے بتایا کہ دونوں کنیزیں انتہائی حسین مگر اتنی ہی خود سر بھی ہیں اور اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتیں۔ مصطفیٰ کو اپنے منصوبے میں کامیابی کی خاصی امید پیدا ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد سیولیکوس نے اس سے اجازت چاہی اور سونے کے لیے محل کے اندر چلا گیا۔

مصطفیٰ کو بھی نیند آ گئی۔ مگر ابھی مشکل سے ایک گھنٹا

سویا ہوگا کہ اسے اپنے قریب تیز روشنی سی محسوس ہوئی اور وہ اُٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنے سامنے حسن کو کھڑا ہوا پایا۔ اسے گمان گزرا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس نے اپنے بازو میں زور کی چٹکی لی' اور پھر اسے یقین آگیا کہ وہ جاگ رہا ہے۔

"تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے گرج کر سوال کیا۔

"سرکار خفا مت ہوں!" حسن نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "آپ مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ میں تو آپ کا پُرانا خادم ہوں! میری ایک درخواست ہے!"

"کیا؟ جلدی کہو؟ تم یہاں کیسے آپہنچے؟"

"میں نے اربذان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔" حسن نے جواب دیا۔ ہمارے اختلاف کا سبب تم ہی ہو۔ سمجھے! اب اگر تم یہ وعدہ کرو کہ اپنی بہن کی شادی مجھ سے کر دو گے تو میں اس کی رہائی میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں۔ اگر نہیں تو پھر میں اپنے نئے مالک کے سامنے جا کر تمھارا بھانڈا ابھی پھوڑ دوں گا!"

مصطفےٰ کا خون کھول اُٹھا۔ اب جبکہ اس کا منصوبہ کامیاب ہوتا ہوا نظر آتا تھا' بیچ میں یہ نیا فتنہ پیدا ہو گیا۔ اب

صرف ایک صورت تھی ـــــ یہ کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ مصطفےٰ نے ایک جست لگائی اور اس پر آ رہا۔ حسن کے ہاتھ سے چراغ فرش پر گرا اور بھڑک کر گل ہو گیا۔ اس نے پوری قوت سے ایک چیخ بلند کی۔

مصطفےٰ کے حواس جواب دے گئے۔ سارا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔ اب اسے اپنی ہی حفاظت کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس نے لپک کر کھڑکی سے باہر نظر ڈالی کہ فرار کا راستہ لے۔ لیکن کھڑکی زمین سے بہت اونچائی پر تھی۔ پھر اس کے باہر صحن کی دیواریں بھی خاصی اونچی تھیں۔ دروازے کے باہر سے کچھ آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ مصطفےٰ نے اپنا خنجر نکال لیا، اپنے کپڑے سمیٹے اور ہمّت کر کے کھڑکی سے کود گیا۔ فرش پر پہنچتے ہی وہ دیوار کی طرف بھاگا اور بڑی تیزی کے ساتھ اوپر چڑھنے لگا۔ پھر اس نے دوسری طرف چھلانگ لگائی۔ اس کے بعد بھی اس نے دم نہ لیا۔ وہ بھاگتا گیا، بھاگتا گیا، اور ایک جنگل کے قریب جا پہنچا۔ اب وہ بُری طرح تھک چکا تھا۔ نڈھال ہو کر وہ فرش پر گر پڑا۔

کچھ دیر بعد اس کے حواس بجا ہوئے۔ اب اس نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہو؟ اُس کا گھوڑا اور خدمت گار سیولیکوس کے محل ہی میں رہ گئے تھے۔ لیکن وہ

جو کہتے ہیں کہ مصیبت آن پڑے تو دماغ بھی خوب تیزی سے چلنے لگتا ہے، مصطفےٰ کا ذہن بھی بہت تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس نے جنگل کے اندر جانے والا راستہ اختیار کیا۔ اور چلتے چلتے ایک گاؤں تک جا پہنچا۔ یہاں اس نے ایک گھوڑا خریدا اور پھر قصباتی آبادی کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر اس نے کسی اچھے طبیب کا پتا دریافت کیا۔ لوگوں نے ایک تجربہ کار طبیب کے گھر کا راستہ دکھا دیا۔ طبیب سے مصطفےٰ نے ایک ایسی دوا طلب کی جو انسان کو موت جیسی گہری نیند سلا دے، اس کے ساتھ ساتھ ایک اور دوا ایسی بھی جو اس نیند کا توڑ کرتی ہو۔ پھر اس نے ایک مصنوعی داڑھی، ایک سیاہ لبادہ، کچھ صندوق صندوقچے، کچھ چھوٹی بڑی بوتلیں خریدیں۔ یہ سارا سامان ایک گدھے کی پیٹھ پر لادا اور واپس سیولیکوس کے محل کو چل پڑا۔ اسے یقین تھا کہ نئے بہروپ میں اسے کوئی بھی پہچان نہ سکے گا۔

اپنی منزل پر پہنچ کر اس نے خود کو ایک طبیب کہہ کر لوگوں سے متعارف کرایا۔ اپنا نام تسکامنکا بودی بابا بتایا۔ سوچ سمجھ کر آگے کا منصوبہ بنایا۔ ہوتے ہوتے اس کی شہرت سیولیکوس کے کانوں تک پہنچی۔ اس کے عجیب و غریب نام نے سیولیکوس کو فوراً متوجہ کر لیا اور اس نے اپنے ملازم خاص کو حکم دیا کہ جا کر

بابا کو اپنے ساتھ لائے۔ پھر تمام کنیزوں کا اس سے معائنہ کرائے۔ مصطفےٰ کا دل خوشی سے بلّیوں اُچھلنے لگا کہ اس طرح اسے ایک بار پھر اپنی بہن کو دیکھنے کا موقع ملے گا۔

سیولیکوس نے کہا: "بابا! دیکھو! سامنے کی دیوار میں ایک سوراخ ہے۔ ایک ایک کر کے تمام کنیزیں اس سوراخ سے اپنا ہاتھ باہر نکالیں گی اور تم ان کی نبض دیکھو گے!"

مصطفےٰ نے نبض دیکھنے کے بجائے دو بدو ان کنیزوں کو دیکھنے پر زور دیا۔ مگر سیولیکوس نے ایک نہ مانی۔ بس اس پر رضا مند ہو گیا کہ وہ سب کے بارے میں تفصیلات بھی بتاتا جائے گا۔

پھر اس نے ایک لمبی فہرست ہاتھ میں لی اور ایک ایک کر کے کنیزوں کے نام پکارنے لگا۔ ہر صدا پر ایک کنیز اپنا ہاتھ سوراخ سے باہر نکال دیتی۔ ساتواں نام فاطمہ کا تھا۔ ایک ننھا سا گورا ہاتھ باہر نکلا۔ مصطفےٰ نے خوشی سے کانپتے ہوئے اس کی نبض پر اپنی انگلیاں رکھ دیں اور کہا —— "یہ لڑکی بیمار ہے!" سیولیکوس نے حکم دیا کہ اس کے لیے فوراً دوا تیار کرائی جائے۔ مصطفےٰ کمرے سے باہر نکل آیا اور جلدی جلدی کاغذ کے ایک پرزے پر یہ عبارت تحریر کی۔

"فاطمہ! میں یہاں تمھیں چھٹکارا دلانے کے لیے آیا ہوں۔

مجھے کامیابی اسی صورت میں ہوگی جب تم میری تجویز کی ہوئی دوا کھالو۔ اس کے اثر سے تم بظاہر بے جان ہوجاؤ گی۔ مگر ڈرو مت! میرے پاس اس دوا کا توڑ بھی ہے۔ اگر تم رضامند ہو تو بس یہ کہلا دینا کہ دوا کا تم پر کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ میں تمھارا اشارہ سمجھ جاؤں گا۔"

مصطفیٰ نے ایک بار پھر فاطمہ کی نبض دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور اس بہانے وہ کاغذ اسے تھما دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے دوا بھی دیدی۔ سیولیکوس فاطمہ کی طرف سے بہت متفکر تھا۔ چنانچہ اس نے بقیہ کنیزوں کا معائنہ دوسرے دن پر ٹال دیا اور مصطفیٰ سے کہا:

"اے معالج! مجھے صاف صاف بتاؤ فاطمہ کی بیماری کیا ہے؟"

مصطفیٰ نے ایک لمبا سانس لیا پھر کہا: "حضور! خدا تم پر رحم کرے! یہ کنیز ایک جان لیوا بخار میں مبتلا ہے۔"

سیولیکوس یہ سُن کر بھڑک اُٹھا۔ چیخ کر بولا ــــــ "تم معالج ہو کہ گدھے! میں نے اس پر دو ہزار اشرفیاں خرچ کی ہیں۔ اگر تم اس کا علاج نہیں کر سکے تو تمھاری جان کی خیر نہیں ہے۔"

اب مصطفیٰ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے

سیولیکوس کو دلاسہ دیا۔ ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک حبشی غلام اندر آیا اور بتایا کہ فاطمہ پر اس دوا کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔

سیولیکوس نے درد بھری آواز میں کہا ــــــ "تم اس کے علاج پر اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دو! مُنھ مانگا انعام ملے گا۔"

"انشاء اللہ" مصطفیٰ کی حلق سے بھرّائی ہوئی آواز نکلی۔

اندر جا کر مصطفیٰ نے وہی نیند والی دوا نکالی۔ پھر غلام کے حوالے کی۔ اس کے بعد اس نے سیولیکوس سے کہا کہ اسے چند مخصوص بوٹیوں کی تلاش ہے جو جھیل کے کنارے اُگتی ہیں۔ یہ کہتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ جھیل کے پاس پہنچ کر اپنا لبادہ اور داڑھی پانی میں پھینک دی اور خود جھاڑیوں کے پیچھے جا چُھپا۔ ذرا دیر بعد اندھیرا پھیل گیا۔ چاروں طرف سنّاٹا طاری تھا۔

اس دَوران میں، مصطفیٰ کی روانگی کے تقریباً گھنٹے بھر بعد سیولیکوس تک یہ خبر پہنچی کہ فاطمہ مرنے کے قریب ہے۔ اس نے فوراً غلاموں کو حکم دیا کہ اس

منحوس طبیب کو ڈھونڈ کر لائیں ۔ کافی چھان بین کے بعد غلاموں نے اسے یہ اطلاع دی کہ بوڑھا طبیب جھیل میں ڈوب گیا ۔ اس کا لبادہ پانی کی سطح پر تیر رہا ہے ۔ اب سیولیکوس نے گریہ وزاری شروع کردی ۔ فاطمہ پر موت کی نیند اچھی طرح طاری ہوچکی تھی اور سبھی اسے مردہ سمجھ بیٹھے تھے ۔ سیولیکوس نے تابوت کی تیاری کا حکم دیا اور فاطمہ کی تدفین کی تیاریاں ہونے لگیں ——

—— ابھی تابوت بردار قبرستان تک پہنچے ہی تھے اور فاطمہ کا تابوت زمین پر رکھا ہی تھا کہ درختوں کے پیچھے سے کسی کے کراہنے کی آوازیں سنائی دیں ۔ قبرستان کی خاموشی میں یہ آوازیں بہت ڈراونی محسوس ہوئیں ۔ خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ آوازیں کچھ اور تیز ہوتی گئیں اور ان کا ڈر بڑھتا گیا ۔ یہاں تک کہ بدحواس ہوکر وہ بھاگ نکلے ۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو مصطفیٰ درختوں کے جھنڈ سے باہر آیا اور اپنا چراغ روشن کیا ۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آوازیں مصطفیٰ ہی کی تھیں ۔ اب مصطفیٰ نے ایک ننھی سی بوتل نکالی جس میں فاطمہ کو دوبارہ ہوش میں لانے کی دوا بھری ہوئی تھی ۔ اس نے تابوت کا ڈھکنا اوپر اٹھایا اور اچانک اس کے پیروں کے نیچے سے زمین

نکل گئی "یہ کیا"؟ اُس نے حیرت سے اُس اجنبی چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تابوت میں فاطمہ کے بجائے کسی اور لڑکی کی لاش تھی۔

چند لمحوں تک مصطفیٰ کے ہوش گم رہے۔ یہ معمہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخرکار اُس نے بوتل سے دوا نکالی اور اُس اجنبی لڑکی کے ہونٹ کھول کر دوا اس کے منھ میں بھر دی۔ پھر کچھ دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھا حیران اور پریشان نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس لڑکی میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ اُس نے ایک جمائی لی اور آنکھیں کھول دیں۔ وہ خوفزدہ نظروں سے مصطفیٰ کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ بیٹھی اور تابوت سے باہر نکل کر اپنے آپ کو مصطفیٰ کے قدموں میں ڈال دیا۔

"میں کن لفظوں میں تمھارا شکریہ ادا کروں! تم نے مجھے ہمیشہ کی قید سے نجات دلائی ہے!" لڑکی نے کمزور آواز میں کہا۔

مصطفیٰ نے اسے چپ ہو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر پوچھا ― "اے عزیزہ! یہ کیا اسرار ہے۔ یہاں تمھارے بجائے فاطمہ کو ہونا چاہیے تھا!"

لڑکی نے کہا ۔۔۔ میرا نام بھی فاطمہ ہے! اے اجنبی! تم نے وہ پیغام مجھی کو تو بھیجا تھا اور وہ دوا بھی مجھے ہی ملی تھی!"

پھر لڑکی نے بتایا کہ جب بھی کوئی کنیز حرم میں لائی جاتی تھی اسے ایک نیا نام دیا جاتا تھا۔ سو اسے بھی فاطمہ کے نام سے پکارا جانے لگا۔ میرے بھائی کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ تاسف بھرے لہجے میں اس نے فاطمہ سے درخواست کی کہ وہ اسے اس کی بہن اور زبیدہ کے بارے میں کچھ بتائے۔ تس پر لڑکی نے اطلاع دی کہ وہ دونوں حرم میں ہیں اور وہاں ان کے نام میرزا اور نور محل ہیں۔

جب لڑکی نے یہ محسوس کیا کہ میرا بھائی حالات کی اچانک کروٹ پر دل شکستہ ہو بیٹھا ہے، تو اس نے تسکین و تشفی کے کلمات سے اس کی ڈھارس بندھانی چاہی۔ اس نے کہا: "ایک صورت ایسی ممکن ہے کہ دونوں لڑکیوں کو حرم سے بحفاظت نکال لیا جائے!"

"کیا؟ کیا؟ اے عزیزہ! جلدی کہو!" مصطفےٰ بیقرار ہو کر بولا۔

لڑکی نے کہا: "میں سیولیکوس کے حرم میں کوئی پانچ مہینے مقید رہی ہوں۔ پہلے ہی دن سے میں فرار کی

ترکیبیں سوچا کرتی تھی۔ یہ تو میں سمجھتی تھی کہ تنہا اپنے بل بوتے پر یہ کام آسان نہیں۔ بہر حال ــــ محل کے صحن میں ایک فوّارہ ہے! ہے نا؟ اس فوّارے نے میری توجہ کھینچی تھی۔ شاید اس لیے کہ عین یہ ایک ویسا ہی ہمارے گھر میں بھی ہے۔ ایک روز میں نے سیولیکوس سے اس فوّارے کی تعریف کی اور پوچھا۔ "یہ کس کی صنّاعی کا نمونہ ہے؟" سیولیکوس نے بتایا کہ خود اس نے بنایا ہے۔ اور اس میں پانی بہت دور کے ایک چشمے سے آتا ہے۔ پانی کی آمد کے لیے ایک سرنگ بنائی گئی ہے، اتنی چوڑی کہ آدمی کھڑا ہو کر بھی آرام سے اس کے اندر چل سکے۔

"یہ سن کر میرے دل میں امید کی ایک کرن چمکی۔ میں نے سوچا، کاش کوئی طاقت ور مرد میرے ساتھ ہوتا اور سرنگ کے دہانے پر جو پتھر رکھا ہوا ہے اسے اٹھا دیتا۔ میں نے بارگاہ خداوندی میں التجا کی کہ کسی کو میری مدد کے لیے بھیج دے۔"

مصطفیٰ نے اس ترکیب پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ لڑکی نے بتایا کہ سرنگ کے دہانے پر رات دن دو پہرے دار متعین رہتے ہیں۔ سو ان سے نپٹنے کے لیے دو ایک اور آدمیوں کی مدد درکار ہوگی۔ مصطفیٰ کو بس اسی بات کی فکر تھی کہ آخر کہاں سے اپنی مدد کے لیے آدمی فراہم کرے۔ دفعتاً اسے اربدان کا عطا کیا ہوا خنجر یاد آیا اور فاطمہ کو ساتھ لے کر وہ آگے چل پڑا۔

شہر میں مصطفےٰ نے ایک طبیب کا سوانگ رچا رکھا تھا۔ سب سے پہلے اس نے شہر کے مضافات میں ایک بوڑھیا کے ساتھ فاطمہ کی رہائش کا بندوبست کیا۔ پھر جو رقم اس کے پاس بچی رہ گئی تھی اس سے ایک عمدہ گھوڑا خریدا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر وہ ان پہاڑوں کی سمت روانہ ہو گیا، جہاں پہلے پہل ارندان سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ منزل تک پہنچنے میں اسے تین دن لگے۔

ارندان کے خیمے وہیں نصب تھے۔ مصطفےٰ کے آنے کی خبر پاتے ہی اس نے گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ مصطفےٰ نے بپتا کہہ سنائی۔ حسن کی غداری کا قصہ سن کر ارندان کا خون کھول اٹھا اور اس نے قسم کھائی کہ اپنے ہاتھوں سے اس ناہنجار کو موت کے گھاٹ اتارے گا۔ اس نے ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا۔ پھر درخواست کی کہ مصطفےٰ ذرا دم لے لے، آرام سے کھائے پیے اور سفر کی تکان سے چھٹکارا پائے۔

وہ رات مصطفےٰ نے ارندان کے خیمے میں گزاری۔ آسمان پر جیسے ہی اگلی صبح کی سپیدی نمودار ہوئی، اس نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ اب ارندان بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ تین ہٹے کٹے جوان بھی ساتھ لے لیے تھے۔ ان سب کے گھوڑے تازہ دم تھے اور ایڑ لگانے پر ہوا سے باتیں

کرتے تھے۔ واپسی کا راستہ انھوں نے دو دن میں طے کر ڈالا۔

شہر تک آنے کے بعد مصطفےٰ نے پہلا کام یہ کیا کہ فاطمہ سے ملاقات کی اور ارندان کی نوازشوں کا حال بتایا۔ پھر اُسے بھی ساتھ لے کر سیولیکوس کے محل کی راہ لی۔ جب شام سر پر آ گئی اور پرندے اپنے آشیانوں کو لوٹ گئے تو دبے پانو چلتے چلتے وہ سب کے سب سُرنگ کے دہانے پر پہنچے۔ فاطمہ نے بتایا کہ صحن میں دائیں بائیں جو دو مینار ہیں، ان میں دائیں طرف والے مینار سے آگے چھٹے نمبر پر ایک دروازہ ہے۔ اس دروازے سے ہو کر فاطمہ اور زریدہ کے کمرے تک پہنچ سکیں گے۔

مصطفےٰ نے فاطمہ اور اپنی مدد کے لیے ساتھ آئے ہوئے جوانوں کو گھوڑوں کی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑا اور اچھی طرح مسلح ہو کر اُس دروازے کی سمت چل پڑا۔ اس کے ساتھ صرف ارندان تھا۔ دونوں نے اللہ کا نام لے کر سرنگ میں قدم رکھے۔ دیکھتے دیکھتے وہ کمر تک پانی میں آ گئے۔ دونوں حوصلہ مند و جری تھے۔ ہمت نہ ہاری اور آگے بڑھتے رہے۔ آدھ گھنٹے میں وہ سرنگ کے اُس دہانے پر پہنچ چکے تھے، جو سیوکیلوس کے محل میں نکلتا تھا، اور فوارے سے ملحق تھا۔

سرنگ کا دہانہ ایک بھاری پتھر سے ڈھکا ہوا تھا۔ دونوں نے چھڑوں کی مدد سے پتھر کھسکانا شروع کیا۔

ذرا دیر کی محنت کے بعد پتھر کھسک گیا۔ ارندان اور

مصطفیٰ صحن کے احاطے میں پہنچ گئے اور دائیں مینار کی طرف، چھٹے دروازے کی طرف بڑھے۔ اس مقام پر ایک نہ دو، چھے حبشی پہرے دار موجود تھے۔ اے عزیزو! اب اسے اتفاق سمجھو یا مصلحتِ خداوندی کہ سب کے سب اس گھڑی خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ اچانک حسن کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس نے اربذان اور مصطفیٰ کو دیکھ کر شور مچایا۔ پہرے دار بیدار ہو گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ حسن کی مدد کو آتے، اربذان جھپٹ کر حسن کے سر پر ہو لیا اور اس ناہنجار کی گردن دبوچ لی۔ وہ مردود اس اچانک حملے کی تاب نہ لا سکا اور جان گنوا بیٹھا۔ اتنی دیر میں مصطفیٰ نے چار پہرے داروں کا کام تمام کر دیا تھا۔ بقیہ دو بھی اُن کے آگے ٹک نہ سکے اور گھٹنے ٹیک دیے۔ اربذان نے ان کے سینوں کی طرف خنجر تان کر پوچھا "میزا اور نور محل کدھر ہیں؟" غلاموں نے بلا آنا کانی کیے ان کے کمرے کا پتا بتایا۔ مصطفیٰ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ فاطمہ اور زبیدہ شور سن کر پہلے ہی جاگ اٹھی تھیں۔ مصطفیٰ کو دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ جلدی جلدی دونوں نے اپنے ملبوسات اور زیورات سمیٹے۔ پھر مصطفیٰ کے پیچھے چل پڑیں۔

اربذان اور مصطفیٰ دونوں لڑکیوں کو ساتھ لیے اس

۷۷

مقام پر پہنچے جہاں اُن کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ وہاں ارندان کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا۔" کیوں نہ اس محل کا کچھ خزانہ لوٹ لیا جائے!"، ارندان نے سختی سے منع کر دیا اور یوں گویا ہوا۔ "میں نہیں چاہتا کہ لوگ مجھے عام قسم کا لیٹرا سمجھیں اور یہ الزام دیں کہ ارندان راتوں کو گھروں پر ڈاکے ڈالتا ہے۔"

حسن کو اپنی غداری کی سزا مل چکی تھی۔ فاطمہ اور زریدہ اس بدبخت کی قید سے رہا ہو چکی تھیں اور خود وہ ملعون قید حیات سے آزاد تھا۔ فاطمہ اور زریدہ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری تھے۔ دونوں نے ارندان کی مدد کا شکریہ ادا کیا۔ ارندان نے کہا۔ "جتنی جلدی ممکن ہو یہاں سے نکل بھاگو! ہو سکتا ہے کہ سیولیکوس کو اس تمام واقعے کی بھنک مل گئی ہو اور وہ اپنی فوج کے ساتھ ہم پر حملے کی تیاری کر رہا ہو۔ مفت میں خون خرابہ ہوگا!"

سب کے سب آگے بڑھ گئے۔ دوسرے دن ارندان نے مصطفےٰ سے رخصت طلب کی۔ مصطفےٰ نے کہا۔ "میں زندگی بھر تمہیں یاد رکھوں گا!"

ارندان نے جواب دیا۔ "اے عزیز! آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔"

۲۸

دوسری والی فاطمہ نے بھیس بدل کر اپنے وطن کی راہ لی۔ مصطفیٰ، بہن فاطمہ اور اس کی سہیلی زریدہ اپنی جنم بھومی کی سمت چل پڑے۔ واپسی کا سفر تھا اس لیے سب کے حوصلے بلند تھے۔ چند دنوں کے اندر اندر یہ لوگ اپنے شہر کی فصیل تک پہنچ چکے تھے۔

اے رفیقو! جب اس حقیر کے والد بزرگوار نے لڑکیوں کو مصطفیٰ کے ساتھ دیکھا تو خوشی سے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ دوسرے ہی دن انھوں نے ایک زبردست ضیافت کا اہتمام کیا۔ شہر بھر کو دعوت دی۔ قسم قسم کے کھانے پکوائے۔ تمام مہمان آچکے تو مصطفیٰ کے حوصلوں کی داد دی اور ارباب ان کے لیے تشکّر کا اظہار کیا۔

مصطفیٰ نے جب اپنا حال کہہ سنایا تو والد نے زریدہ کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور مصطفیٰ کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے ـــ "اے فرزند میں تجھے سچّے دل سے معاف کرتا ہوں اور تیری کارگذاری پر خوش ہوں۔ انعام کے طور پر اس عزیزہ کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دیتا ہوں۔!"

✵ ✵ ✵

لیزہ کی کہانی سب نے بہت غور سے سنی۔ ذرا دیر بعد قافلہ آگے کے سفر پر چل پڑا۔ شام ہوتے ہوتے وہ

صحرا کے دوسرے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ اب ان کے سامنے ہرے بھرے سبزہ زار تھے اور پھول پتوں سے لدے درخت۔ وادی میں ایک سرائے بھی تھی۔ قافلے والوں نے فیصلہ کیا کہ رات اُس کارواں سرائے میں بسر کریں گے۔ وہاں نہ بہت زیادہ گنجائش تھی، نہ کھانے پانی کا کچھ بہت اچھا انتظام تھا۔ مگر سب کے سب خوش تھے اور دل لگی بازی میں مگن تھے۔ اس لیے انھوں نے اس کم انتظامی کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ جو کچھ میسر آیا کھا پی کر خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر سب حلقہ باندھ کر بیٹھے اور باہم ہنسی مذاق کرنے لگے۔ ملیچ نے ایک مضحکہ خیز رقص پیش کیا اور گانا بھی سنایا۔

اس کا مسخرہ پن دیکھ کر زالیوکوس جیسے سنجیدہ شخص کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

اب قصہ سنانے کی باری ملیچ کی تھی۔ سب کے سب اس کے قریب کھسک آئے اور ایک دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔

(آگے کی کہانی اس سلسلے کی اگلی کتاب میں)

کٹا ہوا ہاتھ

(اسرار آمیز کہانیوں کے سلسلے کی دوسری کتاب)

شمیم حنفی

مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

ایک بونے کا قصّہ

شمیم حنفی

مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

ایک بونے کا قصہ

شمیم حنفی

تقسیم کار

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025
Email:maktabajamiadelhi@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003

جنوری 2013ء تعداد:1000 قیمت:-/15 روپے

کلاسک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

ایک بونے کا قصہ

ملیح نے کہانی شروع کی:

اے رفیقو! اس ناچیز کا وطن دمشق ہے۔ بہت دن ہوئے، وہاں ایک بونا رہتا تھا۔ اصل نام اس کا کچھ اور تھا، لیکن سبھی اسے ننھے مُنک کے نام سے پکارتے تھے۔ ان دنوں میری عمر بہت کم تھی۔ پھر بھی اس شخص کے بارے میں مجھے بہت سی باتیں یاد ہیں، کیونکہ ایک بار میرے والد بزرگوار نے صرف اس کی وجہ سے میری اچھی خاصی پٹائی کی تھی۔ ننھا مُنک دیکھنے میں ذرا سا تھا۔ زیادہ سے زیادہ چار فٹ کا، مگر اس کے بال سفید ہو چکے تھے اور جب میں نے اسے دیکھا اس وقت وہ بوڑھا تھا۔ اس کا جسم ٹھگنا تھا۔ سر بہت بڑا۔ عجیب مضحکہ خیز صورت تھی۔ ایک لق و دق حویلی

میں وہ اکیلا رہتا تھا۔ کھانا بھی خود ہی پکاتا۔ گھر سے باہر کم ہی نکلتا تھا۔ ہر روز دوپہر کو اس کے باورچی خانے کی چمنی سے دھواں نکلتا دکھائی دیتا تھا۔ بس اسی ایک بات سے لوگوں کو یہ پتا چلتا تھا کہ وہ گھر آباد ہے۔ کبھی کبھار شام کے وقت وہ اپنی چھت پر چہل قدمی کرتا۔ دور سے ایسا لگتا کہ صرف ایک بڑا سا سر چھت پر لڑھک رہا ہے۔ مہینے میں بس ایک دن حویلی سے باہر قدم نکالتا تھا۔ میں اور میرے سنگی ساتھی خاصے شریر تھے۔ راہ چلتے لوگوں سے چھیڑ خانی کیا کرتے اور جس روز ننھا مُک دکھائی دے جاتا اس روز تو واقعی مزہ آجاتا۔ ہم پہلے ہی سے اس کے دروازے پر جمع ہو جاتے اور اس تاک میں رہتے کہ کب وہ باہر آئے اور ہمارا نشانہ بنے۔ آخر کو ایک خوب بڑا سا سر، اس سے بھی بڑی پگڑی کے ساتھ دروازے سے نمودار ہوتا، پھر تھیلے جیسے پائنچوں میں سے اس کی ننھی ٹانگیں باہر نکلتیں، کمر سے ایک لمبا خنجر بندھا ہوا۔ ایسا لگتا کہ ننھے مُک کی کمر سے خنجر نہیں بندھا ہوا ہے بلکہ وہ خود خنجر کے ساتھ لٹکا ہوا ہے۔ اسے دیکھتے ہی ہم خوشی کے مارے چیخنے لگتے۔ پاگلوں کی طرح ہم اپنی ٹوپیاں ہوا میں اچھالنے لگتے اور اپنے شور سے آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ ننھا مُک ہماری حرکتوں پر ناراض ہونے کے بجائے ہمیں

دعائیں دیتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے چلتے جاتے اور ''ننھے مُنک''، ''بونے مُنک'' کی گردان کرتے رہتے۔ اسے چڑھانے کے لیے ہم طرح طرح سے اس کا مذاق اڑاتے۔ اس پر فقرے چپکاتے۔

اے عزیزو! مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اس غریب کی ہنسی اڑانے میں خود میں پیش پیش رہتا تھا۔ ایک روز تو میں نے اس کی پگڑی کھینچ لی اور اس کی ٹانگوں میں اپنا سر اس طرح پھنسایا کہ بیچارہ زمین پر آرہا۔ اس حرکت پر مزہ تو بہت آیا لیکن یہ دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا کہ وہ میرے والد بزرگوار سے ملاقات کے لیے میرے گھر کے دروزے پر آموجود ہوا۔ میرے والد نے اس سے کچھ باتیں کیں اور بڑی عزت کے ساتھ اسے رخصت کیا۔ میں کواڑ کی اوٹ میں چھپا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بہت دیر تک یوں ہی چھپا رہا۔ آخر کو بھوک نے بے حال کیا اور سر جھکائے میں اپنے والد بزرگوار کے سامنے سے گزرا۔

''ادھر آؤ۔'' والد نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تم ایک بھلے آدمی کو تنگ کرتے ہو۔ تمھیں پتا نہیں کہ وہ بیچارہ کتنا بدبخت ہے اور ہم سب کی ہمدردی کا مستحق ہے۔ خیر، اس کا

قصہ سنانے سے پہلے میں تمھیں تمھاری بدتمیزی کی سزا دینا چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر والد بزرگوار نے اپنی لمبی چھڑی سے مجھے گن کر پچیس ضربیں لگائیں۔ میں سسکیاں لیتا رہا اور چپ چاپ پٹتا رہا۔ یہ مجال نہ تھی کہ ان کے سامنے زبان کھولوں۔ پٹائی ہو چکی تو والد بزرگوار نے مجھے بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں سر نیوڑھائے بیٹھ گیا۔ اب والد نے ننھے مُک کا قصہ شروع کیا۔

ننھے مُک کے والد کا نام مقرہ تھا۔ غریب آدمی تھا۔ مگر شہر میں اس کی بڑی عزت تھی۔ سبب اس کا یہ تھا کہ اس کی زندگی اور طور طریقے فقیروں جیسے تھے۔ دنیا سے الگ تھلگ اپنے گھر میں پڑا رہتا۔ ننھے مُک کی طرح۔ اپنے بیٹے سے اسے قطعاً محبت نہ تھی، یا کم سے کم اس کی کسی بات سے اس محبت کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی، خدا جانے۔ اسے نہ بیٹے کی تعلیم سے دلچسپی تھی نہ تربیت سے۔ سولہ برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد بھی ننھے مُک کا وہی حال رہا۔ بات بات پر اسے باپ کی جھڑکیاں سہنی پڑتیں۔

ایک روز خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ننھے مُک کا بوڑھا باپ سیڑھیاں اترتے اترتے لڑکھڑا کر نیچے گرا اور جان سے ہاتھ دھو

بیٹھا۔ ننھا مُنک کام کا نہ کاج کا۔ پڑھنا لکھنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ عزیز رشتے دار پتھر دل تھے۔ ننھے مُنک کے باپ نے جو کچھ تھوڑے بہت روپے پیسے جوڑے تھے، اس پر قبضہ جما بیٹھے۔ اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ اس نے تن ڈھانپنے کو بس ایک جوڑا طلب کیا۔ خود ننھے مُنک کے پاس ڈھنگ کا کوئی لباس نہیں تھا۔ باپ لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ اس لیے اس کے کپڑے غریب کے بدن پر ٹھیک نہ آتے تھے۔ مگر اس نے اس بات کی پرواہ نہ کی اور باپ کے انہی کپڑوں میں قسمت آزمائی کے لیے گھر سے نکل پڑا۔ اب تک اس کے بدن پر وہی کپڑے نظر آتے ہیں۔ بس ان کی لمبائی ذرا سی چھانٹ دی ہے۔ اس کی بے ہنگم پگڑی، تھیلے جیسے پائنچوں والا پاجامہ، اس کے مرحوم باپ کی یادگار ہے۔ اس کے پاس جو چھڑی اور خنجر ہے، وہ بھی اس کے باپ ہی کا ہے۔

گھر سے نکل کر دن بھر وہ اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ سڑک پر کانچ کا چمکدار ٹکڑا بھی نظر آتا تو اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیتا۔ شاید ہیرا سمجھ کر۔ وہ چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ آخر کو پاؤں جواب دے گئے۔ ایک قدم اٹھانا بھی محال ہو گیا۔ بھوک کے مارے انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔ سڑک کے کنارے کسی پھل دار

درخت سے کچھ پھل توڑے اور بھوک مٹائی۔ پھر زمین ہی پر پڑ کر سو رہا۔ اس حال میں بھی اپنے نصیبوں سے اسے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

دو دن اسی حال میں گزرے۔ تیسرے دن ایک پہاڑی کی چوٹی پر اسے ایک نئی آبادی نظر آئی۔ صاف ستھری، بارونق، حویلیوں کی چھتوں پر رنگ برنگے پرچم لہرا رہے تھے۔ چاروں طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا: "شاید یہاں میرے مقدر کا ستارا چمکے گا۔" تھکن سے حالت خراب تھی۔ مگر لشتم پشتم شہر کی جانب چل پڑا۔ پہاڑی کی چوٹی سے شہر بہت قریب دکھائی دیتا تھا۔ اب جو چلا تو معلوم ہوا کہ اچھا خاصا فاصلہ ہے۔ ساری رات چلتا رہا۔ شہر کی فصیل تک اس وقت پہنچا جب اگلی صبح کا سورج نمودار ہو چکا تھا۔ چند قدم چل کر ستانے کی غرض سے کسی سایے دار پیڑ کے نیچے بیٹھ رہا۔ دم لیتا پھر آگے بڑھ جاتا۔ خدا خدا کر کے فصیل کے اندر داخل ہوا۔ چپلوں میں گرد بھر گئی تھی۔ پاؤں پٹک پٹک کر جھاڑے اور سڑکوں پر مٹر گشتی کرنے لگا۔ لیکن سڑکیں سنسان، دروازے بند۔ کوئی آدم نہ آدم زاد۔ وہ اس بات کا منتظر تھا کہ ابھی کوئی دروازہ کھلے گا اور کوئی اللہ کا بندہ اسے مسافر

جان کر مہمان بنائے گا اور کم از کم ایک وقت روٹی کھلائے گا۔

ایک شاندار حویلی کے سامنے وہ رکا۔ اتنے میں ایک کھڑکی کھلی اور ایک بوڑھی عورت کا سر دکھائی دیا۔ اس نے مُنک کو پکارا:

آؤ آؤ!

کھانا کھاؤ!

جلدی کرو!

مت شرماؤ!
بریانی اور سیخ کباب
نان پراٹھے اور برفاب!
آؤ شتاب، آؤ شتاب!

دروازہ کھلا۔ اتنے میں خدا جانے کہاں سے کتوں بلیوں کی ایک بھیڑ اکٹھی ہوگئی۔ سب کی آنکھیں اسی دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اب مُنک کی سمجھ میں آیا کہ بڑھیا کا پکارنا ایک دعوتِ عام تھا۔ اندر جائے کہ نہ جائے۔ جی کہتا تھا کہ کتوں بلیوں کے ساتھ جانا بے غیرتی ہے۔ پیٹ کہتا تھا جان ہے تو جہان ہے۔ بیکار کی شرم چھوڑ اور اپنے آپ پر ظلم نہ کر۔ بہت ہو چکا۔ ہمت کر کے ننھے مُنک نے حویلی کے دروازے میں قدم رکھا۔ اس کے آگے آگے دو بلیاں تھیں۔

بلیاں سیڑھی کی جانب لپکیں۔ ننھا مُنک بھی انھیں کے پیچھے ہولیا۔ اوپر وہ بوڑھی عورت دکھائی دی۔ مُنک پر نظر پڑتے ہی اس کی تیوری چڑھ گئی۔ تنک کر بولی:

''تو کون ہے؟ کیا نام ہے؟ تیرا یہاں کیا کام؟''

ننھے مُنک نے جواب دیا: ''مسافر ہوں، تھکا مارا۔ بھوکا

ہوں۔ کتے بلی تمھاری دعوت پر آ گئے اور تم نے خوشی خوشی ان کا خیر مقدم کیا۔ میں تو آدم کی اولاد ہوں۔ اے نیک بخت! مسافر نوازی تجھ پر فرض ہے۔"

بڑھیا یہ سن کر مسکرائی۔ سوال کیا:

"اے اجنبی بونے! تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس شہر میں کیوں کر وارد ہوئے؟ ساری بستی جانتی ہے کہ میں صرف بلیوں کی ضیافت کا اہتمام کرتی ہوں۔ کتے تو بن بلائے اندر گھس آتے ہیں۔"

ننھے مُنک نے اسے اپنی آپ بیتی سنائی۔ ایک ٹکڑا نان اور ایک بوٹی گوشت کا طالب ہوا۔ بڑھیا کا دل پسیج گیا۔ اس نے خوب ڈھیر سے کھانے اس کے سامنے سجا دیے۔ ننھے مُنک نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اور شکر اس نیلی چھتری والے کا ادا کیا جو بندے کو رزق پہنچانے کے اسباب ہر حال میں مہیا کرتا ہے۔

ننھا مُنک جب کھاپی کر ڈکاریں لینے لگا تو بڑھیا بولی: "تم چاہو تو اسی گھر میں قیام کرو۔ گھر کے انتظام میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ تین وقت پیٹ بھر کے کھاؤ اور چین کی بنسی بجاؤ۔"

ننھے مُنک کی زبان پر گوشت، روٹی، بریانی، کباب کا

ذائقہ ابھی تازہ تھا۔ بڑھیا کی دعوت قبول کی اور اس کی ملازمت میں آ گیا۔

بڑھیا کا نام بیگم اہزوی تھا۔ چھے عدد بلیاں اس کی پالتو تھیں۔ مُک کے ذمے کام یہ تھا کہ روز صبح ان کے بدن کی مالش کرے۔ نہلائے دھلائے اور جب بیگم اہزوی گھر سے باہر جائے تو بلیوں کی حفاظت کرے۔ کھانے کا وقت ہو تو ان کا دسترخوان لگائے۔ رات کے وقت انھیں لے جا کر مخمل کے بستر پر سلا دے۔ گھر میں بلیوں کے علاوہ کچھ کتّے تھے مگر ان کی طرف سے اہزوی بہت لاپرواہ تھی۔

کام تو زیادہ محنت کا نہیں تھا۔ مگر انوکھا ضرور تھا۔ پھر تنہائی بھی تھی۔ کتوں بلیوں کے علاوہ بس ایک بیگم اہزوی کی ذات تھی۔ اس کے بعد بس اللہ کا نام۔ ننھا مُک بڑھیا کی ہدایت کے مطابق بلیوں کی خدمت کرتا۔ جی بھر کے کھاتا اور سوتا۔ بڑھیا بھی اس سے خوش نظر آتی تھی۔

لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، بلیاں مصیبت بنتی گئیں۔ بڑھیا گھر سے باہر جاتی تو وہ دھما چوکڑی مچاتیں۔ کبھی کوئی برتن توڑ دیا، کبھی میاؤں میاؤں کا وظیفہ شروع کر دیا۔ کبھی غرانا اور ایک

دوسرے پر جھپٹنا، لیکن جیسے ہی اپنی مالکہ کے پیروں کی چاپ ان کے کان تک پہنچتی تو وہ چپکی ہو جاتیں اور دم سادھ لیتیں۔ اپنے گدوں پر جا بیٹھتیں اور دُم ہلانے لگتیں۔ بڑھیا جب ٹوٹے ہوئے برتن یا گھر میں افراتفری دیکھتی تو ننھے مُنک کو بُرا بھلا کہتی۔ وہ غریب لاکھ اپنی صفائی پیش کرتا لیکن بڑھیا کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔ وہ یہی سمجھتی کہ ننھا مُنک جھوٹ بول رہا ہے اور اپنی غلطی کا الزام اس کی معصوم بلیوں کے سر ڈال رہا ہے۔ بلیاں بڑھیا کی نظر بچا کر شرارت آمیز انداز میں ننھے مُنک کی طرف دیکھتیں۔ ننھے مُنک نے سوچا اس طرح تو زندگی گزرنے سے رہی۔

....

ننھا مُنک تقدیر کی اس کروٹ پر حیران تھا اور پریشان بھی۔ اس نے جی میں ٹھانی کہ اس بڑھیا کی غلامی سے چھٹکارا پائے اور کہیں اور جا کر مقدر آزمائے۔ مگر جیب خالی ہو تو ہمت جواب دے جاتی ہے۔ اس نے سوچا کہ پہلے بڑھیا سے اتنے دنوں کی غلامی کا معاوضہ وصول کر لے پھر کہیں جائے۔ اب تک اس کم بخت نے بیچارے کو ایک دھیلا بھی نہیں دیا تھا۔ روز روز وعدے کرتی اور ٹال جاتی۔ اس حویلی میں ایک کمرہ کبھی نہ کھلتا تھا۔

سوائے اس وقت کہ جب بڑھیا کسی کام سے ذرا دیر کے لیے اندر جاتی۔ مُنک کو کرید ہوئی کہ پتا لگائے اس کمرے میں کیا بھید چھپا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنی ساری نقدی، خزانہ وہیں رکھتی ہو۔

ایک روز بڑھیا حسب معمول صبح سویرے کہیں چل دی۔ ابھی اس نے باہر کا دروازہ بند کیا ہی تھا کہ ایک کتّے نے مُنک کے کرتے کا دامن اپنے منہ میں بھر لیا اور اسے ایک طرف کھینچنے لگا۔ اس کتّے سے بڑھیا کو خدا واسطے کا بیر تھا اور وہ اسے ہمیشہ جھڑکتی رہتی تھی۔ برخلاف اس کے کتّے کو مُنک سے بہت محبت تھی۔ اور وہ فرصت کے اوقات میں گھنٹوں اس کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔ مُنک کتّے کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ کتا بڑھیا کی خواب گاہ کے سامنے ایک چھوٹے سے دروازے کے پاس ٹھہر گیا۔ دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ کتا ننھے مُنک کو گھسیٹتا اندر گھس گیا۔ مُنک کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ آخر کو وہ اس کمرے میں پہنچ ہی گیا جس کے بارے میں ہمیشہ سوچتا رہتا تھا۔ اس نے جلدی جلدی چاروں سمت نظر دوڑائی۔ بس کچھ پھٹے پرانے کپڑے دکھائی دیے۔ نہ مال، نہ خزانہ۔ چیتھڑوں کے علاوہ چند بھدّی طشتریاں تھیں۔ اس نے ایک طشتری اٹھائی۔ اچانک وہ اس کے ہاتھ سے پھسلی اور فرش پر چکنا چور ہوگئی۔

ننھے مُنک کا جی سَن سے ہو گیا۔ اب کیا ہو گا؟ وہ سوچنے لگا۔ پاؤں اس کے گویا فرش پر جم سے گئے تھے۔ اب تو بھاگنا ہی پڑے گا نہیں تو بڑھیا جان کو آ جائے گی۔ لیکن جب بھاگنا ہی ہے تو خالی ہاتھ کیوں جائے؟ بہت غور کرنے کے بعد اس نے خوب بڑی چپلوں کا ایک جوڑا اٹھایا۔ پھر ایک چھڑی جس کے مُٹھ پر شیر کا سر بنا ہوا تھا، وہ بھی اٹھا لی اور باہر نکل گیا۔ جلدی جلدی اس نے اپنی پگڑی سنبھالی اور بھاگ نکلا۔ وہ چلتا رہا، چلتا رہا۔ آخر تھکن سے بے حال ہو گیا۔ آج کے جتنا تیز وہ اس سے پہلے کبھی نہیں چلا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی اَن دیکھی طاقت اسے اپنے آپ کھینچے لیے جا رہی ہے۔

اچانک اسے خیال آیا کہ چلتے وقت اسے خود کوئی محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔ بلکہ چپلیں آپ سے آپ آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ تو کیا ان میں کوئی جادو ہے؟ مُنک کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے سوچا کہ اب شاید قسمت اس کا ساتھ دینے والی ہے۔ چند لمحوں بعد اسے نیند ستانے لگی اور وہیں ایک پیڑ کے نیچے پڑ کر سو گیا۔

نیند خوب گہری آئی۔ پھر ایک خواب دکھائی دیا۔ وہ کیا دیکھتا ہے کہ وہی کتا جو اس کا دامن کھینچتا ہوا اسے کمرے تک لے

گیا تھا، اس کے سامنے کھڑا ہے اور اس سے یوں مخاطب ہے:

''ننھے مُک! تمھیں اب تک ان چپلوں کی کرامات کا اچھی طرح اندازہ نہیں۔ اگر تم انھیں پہن کر بس تین مرتبہ اپنی جگہ

پر ایڑی کے بل گھوم جاؤ تو پل بھر میں جہاں چاہو گے وہاں پہنچ جاؤ گے اور یہ چھڑی بھی جادوئی ہے۔ اور یہ ایک دفینے کی تلاش میں مدد دے گی۔ بس یہ سمجھ لو کہ جس مقام پر یہ چھڑی تین بار زمین سے ٹکر مارے وہاں سونے کا خزانہ ہوگا۔ جہاں دو بار ٹکر مارے وہاں چاندی کا۔"

کچھ دیر بعد منک کی آنکھ کھل گئی تو اس نے خواب کی باتیں یاد کیں۔ اس نے چپل پہن کر ایڑی کے بل اپنی جگہ تین بار چکر کاٹے اور گرتے گرتے بچا۔ بچارے کے پیر چھوٹے تھے، چپلیں بڑی۔ کئی دفعہ اس نے کوشش کی اور ناک کے بل زمین پر آ رہا۔ پھر بھی اس نے ہار نہیں مانی اور آخر کو کامیاب ٹھہرا۔ اس نے دل میں یہ خواہش کی کہ قریب ترین بستی میں پہنچ جاؤں۔ اور یہ لو! دَم کے دَم میں چپلوں نے اسے ہوا میں اڑایا اور بادلوں کے اوپر تیرتا وہ ایک بھرے پُرے بازار میں جا کھڑا ہوا۔ چاروں طرف قسم قسم کی بارونق دکانیں، ان پر آدمیوں کا ہجوم۔ اتنی بڑی چپلیں پہن کر چلنے میں وہ کسی نہ کسی سے ٹکراتا اور ٹکرانے والا اسے آنکھیں دکھاتا۔

ننھے منک نے سڑک کا ایک گوشہ منتخب کیا جہاں بھیڑ کم تھی۔ اب وہ سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کرنے لگا کہ روپے کیوں

کر کمائے جائیں۔ جادوئی چھڑی اس کے پاس تھی لیکن سونے یا چاندی کی دفینے سڑک پر تو ملنے سے رہے۔ آخر کہاں تک وہ تلاش میں وقت گنواتا۔ ہاں! چپلوں سے وہ کچھ کام لے سکتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اسے کوئی نامہ بردار کے طور پر ملازم رکھ لے۔ لیکن کون؟ مُک نے سوچا، کیوں نہ بادشاہ کے دربار میں قسمت آزمائی کی جائے۔ اس نے محل کا پتا معلوم کیا اور چند لمحوں بعد شاہی دربان کے سامنے جا پہنچا۔ دربان نے ڈپٹ کر پوچھا: ''کیا چاہتا ہے؟''

مُک نے کہا: ''اے عزیز! ملازمت کی تلاش ہے۔''

''تم کس کام کے لائق ہو؟'' دربان پھر گھڑک کر بولا۔

''پیغام رسانی کا کام خوش اسلوبی سے کرسکتا ہوں۔'' مُک نے لجاجت سے کہا۔

دربان نے قہقہہ لگایا: ''ٹھگنا قد اور بالشت بھر کی ٹانگیں! تم کیا پیغام رسانی کرو گے؟ تمھاری عقل گھاس چرنے گئی ہے کیا؟''

مُک نے اسے اپنی استعداد کا یقین دلایا اور یوں گویا ہوا کہ: ''اے مرددانا! میں اس بستی میں سب سے تیز بھاگنے والے کو اگر پچھاڑ نہ دوں تو نام بدل لوں گا۔ آزمائش شرط ہے۔''

دربان کو بڑی ہنسی آئی۔ مُنک کی بات کو خالی خولی ڈینگ سمجھا اور ٹالنے کی غرض سے کہا: "اچھا آج ہی شام کو دیکھے لیتے ہیں۔"

پھر وہ مردِ مہربان اسے شاہی طعام خانے میں لے گیا اور ملازموں سے کہا کہ اسے پیٹ بھر کھانے کو دے دو۔ کوئی بہانہ اس کے ہاتھ نہ آنے پائے اور آخر میں یہ نہ کہے کہ "بھوکے پیٹ دوڑا نہیں گیا۔"

مُنک کو طعام خانے کے ملازموں کے سپرد کر کے دربان بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے حال اس ڈینگیے بونے کا کہہ سنایا۔ بادشاہ تفریح پسند تھا۔ اس نے سوچا اسی بہانے ایک کھیل ہو جائے۔ محل کے سامنے ایک لق و دق سبزہ زار تھا۔ اسی میں دوڑ کے مقابلے کا انتظام کیا گیا۔ سارے درباری شام ہوتے ہی سبزہ زار کے کنارے جمع ہو گئے۔ پھر ہوتے ہوتے اس مقابلے کا شہرہ بستی کے لوگوں تک جا پہنچا۔ جوق در جوق لوگ محل کی سمت چل پڑے۔

مقررہ وقت پر بادشاہ اور شہزادے اور شہزادیاں بھی آن موجود ہوئیں۔ ننھے مُنک نے جھک کر ادب سے سلام کیا۔ تماشائی

اس کے قد وقامت، شکل وصورت، لباس حلیہ سب کو دیکھ دیکھ ہنستے تھے۔ چھوٹی چھوتی ٹانگوں پر بے ڈول سا جسم، خوب بڑا سا بے ہنگم سر، لمبے لمبے پائچوں والا پاجامہ، بغل میں خنجر اور پیروں میں لگ بھگ آدھے قد کے برابر عجیب وضع کی چپلیں۔ مُنک نے لوگوں کی ہنسی کا ذرا بھی بُرا نہ مانا اور بڑے اطمینان کے ساتھ دوڑ کے مقابلے میں اپنے حریف کا انتظار کرتا رہا۔

اتنے میں بستی کا سب سے تیز دوڑنے والا جوان آن وارد ہوا۔ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے ہو گئے۔ شہزادی عمارہ نے اپنی اوڑھنی کو پرچم کی طرح لہرایا اور دونوں بھاگ نکلے۔ شروع میں مُنک کا حریف آگے رہا، مگر جادوئی چپلوں کی مدد سے جلد ہی مُنک نے اسے پیچھے چھوڑ دیا اور چند لمحوں بعد اس نشان تک جا پہنچا جہاں دوڑ ختم کرنی تھی۔ اس کا حریف بدنصیب گزوں پیچھے تھا۔

مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کسی نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ایک بونا ایک ہٹے کٹے دراز قد نوجوان پر اس طرح بازی لے جائے گا۔ بادشاہ نے مُنک کو خوب شاباشی دی۔ پھر تو سارا مجمع تالیاں پیٹ پیٹ کر مُنک کو مبارک باد دینے لگا۔ ''مُنک زندہ باد'' کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔

مُک نے مجمع کے سامنے جھک کر اظہارِ تشکر کیا۔ پھر خود کو بادشاہ کے قدموں میں ڈال دیا اور ملتجی ہوا کہ اسے پیغام رسانی کا کام دے دیا جائے۔

بادشاہ نے کہا: "نہیں، تمھیں اس سے بہتر کام دیا جائے گا۔ تم ہر وقت ہماری خدمت میں حاضر رہو گے اور ہمارے مصاحبِ خاص کی حیثیت تمھیں حاصل ہوگی۔ سال کے سال تنخواہ

کے طور پر سو اشرفیاں پاؤ گے اور ناشتہ کھانا شاہی ملازمین کے ساتھ کھاؤ گے۔''

مُک کا چہرا کھل اٹھا۔ اس نے سوچا، خوش نصیبی کا دور اب شروع ہوا ہے۔ وہ بڑی تن دہی سے اپنا کام انجام دینے لگا۔ بادشاہ اپنے تمام خفیہ پیغام اس کے ذریعے بھیجتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ بادشاہ کی ناک کا بال بن گیا۔

اس پر، اے رفیقو! دوسرے درباری جل بھُن کر خاک ہونے لگے۔ انھوں نے مل کر یہ بیڑا اٹھایا کہ اس بونے کو بادشاہ کی نظر میں ذلیل کر کے چھوڑیں گے، لیکن جیسے جیسے ان کی سازشیں بڑھتی گئیں، بادشاہ سے مُک کی قربت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

مُک کو درباریوں کی رقابت اور سازشوں کا خوب پتا تھا۔ مگر اس عزیز کا قد چھوٹا اور دل بڑا تھا۔ اس نے کوئی جوابی حملہ نہیں کیا۔ بس یہ کوشش کرتا رہا کہ درباریوں کے دل اس کی طرف سے صاف ہو جائیں۔

ایک روز اس نے سوچا کہ کیوں نہ جادوئی چھڑی کی مدد سے خزانہ تلاش کیا جائے۔ خزانہ مل جائے تو کیا عجب کہ سارے درباری اس سے مقابلے کا خیال چھوڑ دیں۔ اس نے اکثر یہ اڑتی

پڑتی سنی تھی کہ بادشاہ کے مرحوم باپ نے ایک دفینہ چھوڑا ہے، جس کا سراغ کسی کو آج تک نہ مل سکا۔ بادشاہ کے مرحوم باپ نے یہ دفینہ اس وقت چھپایا تھا جب اس کی مملکت پر کسی غنیم کے حملے کا اندیشہ تھا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد وہ اچانک چل بسا اور اپنے بیٹے کو دفینے کا پتا نشان بتانے کی مہلت بھی اسے نہ مل سکی۔

اب مُک جب بھی باہر نکلتا جادوئی چھڑی اس کے ساتھ ہوتی۔ ایک شام ایسا ہوا کہ وہ ہاتھ میں چھڑی لیے باغ کے ایک ویران گوشے میں ٹہل رہا تھا۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ چھڑی آپ ہی آپ کانپ رہی ہے۔ پھر اسی مقام پر چھڑی تین بار فرش سے ٹکرائی۔ مُک کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ تو کیا دفینہ یہیں چھپا ہوا ہے۔ اس کے دماغ نے کہا۔ ہاں یقیناً۔ کتے نے خواب میں یہی نشانی تو بتائی تھی۔ مُک نے بغل سے خنجر نکالا اور اس مقام پر جو پیڑ ایستادہ تھا، اس پر نوک سے نشان بنانے لگا۔ پھر وہ محل کی طرف واپس چل پڑا۔ اس نے ایک کلہاڑی تلاش کی اور رات کا انتظار کرنے لگا۔

رات آئی۔ مُک کلہاڑی لے کر باغ کے اس گوشے کی سمت چل پڑا۔ کھدائی شروع کی۔ ذرا ہی دیر میں ہانپ گیا۔ یہ کام

اتنا آسان نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ دو گھنٹے کی محنت کے بعد زیادہ

سے زیادہ دوفٹ گہری کھدائی ہوئی ہوگی۔ آخر کلہاڑی کسی سخت چیز سے ٹکرائی۔ یقینی طور پر یہ کوئی ٹھوس چیز تھی۔

مُک کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔ آخر محنت ٹھکانے لگی۔ اب وہ اور جوش کے ساتھ کلہاڑی چلانے لگا اور اسے لوہے کا ایک ڈھکنا سا دکھائی دیا۔ مُک گڈھے میں کود پڑا۔ ذرا دیر کی محنت کے بعد ڈھکنا کھل گیا۔ یہ ایک بڑا سا برتن تھا۔ لبالب اشرفیوں سے بھرا ہوا۔ مُک نے برتن گڑھے سے نکالا۔ اپنی تمام جیبیں اشرفیوں سے بھرلیں اور اندھیرے میں چھپتا چھپاتا اپنے کمرے تک جا پہنچا۔

کمرے میں ساری اشرفیاں اس نے فرش پر دری کے نیچے چھپادیں۔ اس نے سوچا سبھی دولت کے دوست ہوتے ہیں۔ اب کسی کو اس سے دشمنی کا خیال نہ آئے گا۔ اس نے مٹھی بھر بھر کر اشرفیاں تمام درباریوں کو دیں۔ بجائے خوش ہونے کے وہ نابکار اور بھی جل بھن گئے۔

خانساماں نے کہا: ''یہ بونا بلاشبہ جعل ساز ہے۔'' دربان نے لوگوں سے کہنا شروع کردیا کہ مُک نے بادشاہ کو فریب دے کر یہ دولت اڑائی ہے۔ محل کا خزانچی مُک سے بے حد جلتا تھا۔ اس نے یہ اڑائی کہ مُک نے چوری کی ہے۔

ان سب نے یہ طے کیا کہ اس معاملے کی کھوج کرنی چاہیے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ بادشاہ کو کسی بہانے خبر کردی جائے۔

آخر ایک منہ چڑھے درباری نے ایک روز بادشاہ سے کہا:

''حضور! ان دنوں غلام سے کچھ کبیدہ خاطر ہیں۔''

''یہ خیال تمھیں کیوں کر ہوا؟'' بادشاہ نے حیرت سے پوچھا۔

درباری بولا: ''حضور! اس بونے پیغام رساں پر ان دنوں اشرفیوں کی بارش کر رہے ہیں۔''

بادشاہ کو سخت حیرت ہوئی۔ اس نے کہا: ''پہیلیاں نہ بجھاؤ اور ساری باتیں صاف صاف کہو۔''

درباری نے خوب نمک مرچ لگا کر بادشاہ کو مُک کی فیاضی کا قصہ سنایا۔ بادشاہ نے سوچا، ہو نہ ہو مُک واقعی چور ہے۔ اُدھر خزانچی نے اس پردے میں خزانے پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے بادشاہ سے بتایا کہ خزانے سے اشرفیوں کی کئی تھیلیاں غائب ہیں۔ اب تو بادشاہ کو یقین آ گیا۔ اس نے ملازموں کو حکم دیا کہ آج سے مُک پر آٹھوں پہر نظر رکھی جائے تا کہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑا جا سکے۔

....

اس کے بعد کا احوال ذرا غور سے سنو۔ اے عزیزو! تم اس قصے کو بہت دلچسپ پاؤ گے۔

ننھے مُنک نے اسی رات ٹھیک اسی وقت جب آدھی رات اِدھر تھی اور آدھی رات اُدھر، اپنی کلھاڑی اٹھائی اور محل کے باغ کی سمت چل پڑا۔ اس وقت تک اس کے ہاتھ جو اشرفیاں آئی تھیں، سب کی سب اس نے لوگوں میں بانٹ دی تھیں۔ اس کا اپنا ہاتھ خالی تھا۔ سو اس نے سوچا کہ اس کمی کی تلافی کر لی جائے۔ سپاہیوں کا ایک دستہ اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ اس کے پیچھے شاہی باورچی تھا، اہولی اور اہولی کے پیچھے ارشد تھا، وہ ناہنجار خزانچی۔

ابھی مُنک اشرفیوں سے اپنی جیبیں بھر ہی رہا تھا کہ سپاہی اس پر جھپٹ پڑے، جیسے بلّی چوہے پر جھپٹتی ہے۔ انھوں نے مُنک کے ہاتھ پاؤں رسّی سے باندھ دیے اور اسے کھینچتے ہوئے بادشاہ کے سامنے لائے۔ بادشاہ بلا کا بدمزاج تھا۔ پھر اس وقت تو اسے سوتے سے جگایا گیا تھا۔ اس لیے وہ کچھ اور زیادہ گرم ہو رہا تھا۔ مُنک کو دیکھتے ہی اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے جرح شروع کر دی۔ باورچی اور خزانچی جو مُنک کی جان کے دشمن تھے،

اس کی کلھاڑی اور اشرفیوں سے بھرا ہوا برتن بھی لے آئے۔ ارشد نے بادشاہ کو یہ پٹّی پڑھائی کہ مُنک یہ برتن زمین میں دفن کرنے جا رہا تھا۔ اسی وقت اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

بادشاہ نے گھڑک کر پوچھا: "اے بونے! کیا یہ صحیح ہے؟"

مُنک نے کہا: "یہ جھوٹ ہے۔ میں نے یہ برتن زمین سے کھود کر برآمد کیا تھا۔ میں اسے دفن کرنے نہیں جا رہا تھا۔"

یہ جواب سن کر حاضرین نے ایک قہقہہ لگایا مگر بادشاہ ہنسے

کے بجائے زور سے چلایا: "اے کمینے! تو جھوٹ بولتا ہے۔ میری آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے۔"

پھر بادشاہ نے خزانچی سے کہا: "ذرا یہ بتاؤ کہ خزانے سے جو رقم غائب ہوئی ہے وہ اس برتن میں پائی گئی رقم کے برابر ہے یا نہیں۔"

خزانچی نے تو پہلے ہی جواب سوچ رکھا تھا، جھٹ بولا:

"بس یہی رقم خزانے سے چوری کی گئی تھی۔"

اب تو بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ مُنک کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے قید خانے میں ڈال دیا جائے اور یہ ساری رقم خزانے میں دے دی جائے۔ خزانچی کی باچھیں کِھل گئیں۔ سازش کامیاب ہوئی تھی۔ اس نے گھر پہنچ کر برتن سے اشرفیاں نکالیں۔ نیچے ایک رقعہ بھی دبا ہوا تھا، جس پر یہ تحریر رقم تھی۔

"دشمن ہمارے ملک پر غالب آ گیا ہے، اس لیے میں اپنے خزانے کا کچھ حصہ یہاں چھپا رہا ہوں۔ یہ دولت جس شخص کے ہاتھوں لگے وہ اسے چپ چاپ میرے بیٹے کے سپرد کر دے، ورنہ میری بددعا کا شکار ہوگا۔"

(بادشاہ سعدی)

ننھا مُک غریب اپنی کال کوٹھری میں مایوس و نامراد پڑا ہوا تھا۔ اسے یہ پتا تھا کہ شاہی خزانے سے چوری کی سزا موت بھی ہوسکتی ہے۔ اس پر بھی وہ اپنی چھڑی کا راز کھولنے پر آمادہ نہیں تھا کہ کہیں کوئی اسے چھین نہ لے۔ اب اسے چپلوں سے بھی کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی کیونکہ اسے دیوار میں لگے ہوئے چھڑ سے باندھ دیا گیا تھا۔

بہرحال، اے عزیزو! دوسرے دن اسے موت کی سزا سنادی گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جان دینے سے یہ بہتر ہوگا کہ چھڑی کا راز فاش کردیا جائے۔ یہ سوچ کر اس نے بادشاہ سے آخری ملاقات کی درخواست کی۔ پہلے پہل تو بادشاہ اسے غپ سمجھا لیکن جب مُک نے یہ دعوا کیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے کر دکھانے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے تو بادشاہ کو تھوڑا بہت یقین سا آ چلا۔ مُک نے اس سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ اگر اس کی بات سچ نکلی تو بادشاہ اس کی موت کا حکم واپس لے لے گا۔ بادشاہ اس پر بھی راضی ہوگیا۔ اس نے مُک کی ہدایت کے مطابق چند اشرفیاں ایک جگہ زمین میں چھپادیں اور مُک سے کہا کہ اس کا پتا لگائے۔ جادو کی چھڑی کی مدد سے مُک نے چند لمحوں میں وہ جگہ ڈھونڈ نکالی۔

اب تو بادشاہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ اسے یقین آ گیا کہ خزانچی نے اسے دھوکا دیا ہے۔ غصے کے مارے اس کا خون کھول اٹھا۔ اس نے ریشم کی ایک ڈور خزانچی کے گھر بھجوائی کہ اس کا پھندا گلے میں ڈال کر اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لے نہیں تو کتے کی موت مارا جائے گا۔ اس کے بعد اس نے مُک سے کہا: "میں نے تمھاری جان بخشی کا وعدہ کیا تھا۔ سو جان بخشتا ہوں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تمھارے پاس اس جادوئی چھڑی کے علاوہ کچھ اور راز بھی ہیں۔ تم صاف صاف بتاؤ کہ اتنا تیز بھاگنے کا بھید کیا ہے؟ اور وہ کون سی طاقت ہے جو پل بھر میں تمھیں دور دراز مقامات تک پہنچا دیتی ہے۔ جب تک تم سب کچھ نہ بتادو گے تمھیں قید میں رہنا ہوگا۔"

ایک ہی دن میں مُک قید خانے کی زندگی سے تنگ آ گیا تھا، سو اس نے چپلوں کی کرامات کہہ سنائیں۔ بادشاہ نے اس چپل کو خود بھی پہن کر آزمایا اور مُک کی بات کو درست پایا۔ مگر وہ مُک سے یہ پوچھنا بھول گیا کہ ان چپلوں کو پہننے کے بعد بھاگتے بھاگتے رکنے کا کیا طریقہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسلسل ناچتا رہا، ناچتا رہا، سارے باغ کا چکر کاٹتا رہا اور رکنے کی خواہش کے باوجود،

رکنے پر قادر نہ ہو سکا۔ چند لمحوں بعد ہی اس کی حالت غیر ہوگئی۔ تھکن سے بے حال ہو گیا۔ آخر کو بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ مُک جی ہی جی میں خوش ہو رہا تھا کہ بادشاہ کے ہاتھوں جو تکلیف اس نے اٹھائی تھی، اس کا بدلہ اس نے لیا۔

ہوش میں آنے پر بادشاہ گرجنے برسنے لگا۔ ''اے ناہنجار! تیری جان بخشی کا وعدہ کر چکا ہوں اس لیے مجبور ہوں۔ نہیں تو اس گستاخی کا مزہ چکھاتا۔ اب اس سے پہلے کہ یہ دن گزر جائے تو اس ملک کی سرحد سے نکل جا ورنہ جان گنوائے گا۔''

بادشاہ نے جادوئی چھڑی اور چپل اپنے قبضے میں کر لیے۔ مُک بچارہ جان گنوانے کے ڈر سے چپ چاپ ظالم بادشاہ کی ریاست چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا اور جیسے مفلس اور خراب وہاں آیا تھا اسی مفلسی اور بدحالی کے ساتھ وہاں سے کہیں اور جانے کے لیے چل پڑا۔ اسے رہ رہ کر اپنی حماقت پر افسوس ہو رہا تھا کہ اتنی قیمتی چیزیں اس کے ہاتھ سے نکل گئیں۔

اس ملک کا رقبہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ یہ مُک کی خوش نصیبی تھی، سو آٹھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہی وہ سرحد تک پہنچ گیا، مگر یہ آٹھ گھنٹے بھی کچھ کم نہ تھے۔ چپلوں کا عادی ہو جانے کی وجہ سے مُک

آرام طلب ہو گیا تھا اور پیدل چلنے کی اسے اب عادت نہیں رہ گئی تھی۔ بہرنوع، لشٹم پشٹم وہ سرحد تک پہنچا۔ سرحد پار کی اور ایک گھنٹے بعد جنگل میں داخل ہو گیا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ کوئی جائے پناہ دکھائی دے جہاں رات چین سے بسر ہو۔ کچھ آگے ایک چشمہ

دکھائی دیا جس کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ کنارے نرم گھاس اور دیودار کے درختوں کی قطار تھی۔ وہ پُر فضا مقام مُک کے جی کو بھایا اور اس نے وہیں فرش کو اپنا بستر بنایا۔ اس نے جی میں ٹھانی کہ آدمی کی ذات بے وفا ہے، اس لیے اب ہمیشہ کے لیے انسانوں سے دور رہے گا اور اسی جنگل میں عمر بھر اللہ اللہ کرے گا۔ جنگلی پھل کھائے گا اور چشمے کا پانی پیے گا۔ آدمی کا منہ بھی نہ دیکھے گا جب تک جیے گا۔

یہ سب سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو غریب بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا۔ پاس ہی انجیر کے چند درخت تھے۔ پکے پکے پھلوں سے خوب لدے ہوئے۔ مُک کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے چند انجیر کھائے۔ چشمے کا پانی پینے کے لیے نیچے جھکا لیکن — یہ کیا؟ پانی میں اس نے اپنا جو عکس دیکھا وہ کیسا تھا؟ سر پر گدھوں جیسے لمبے لمبے کان نکل آئے تھے، چہرہ لمبوترا ہو گیا تھا اور ناک پھول کر غبارہ ہو گئی تھی۔ مُک دہشت زدہ ہو کر چیخ پڑا۔

"یا خدا! یہ میرے اپنے کرتوت کا پھل ہے۔ میں سچ مچ گدھا ہوں۔ میں نے اپنے ہاتھوں اپنی دولت گنوائی ہے۔ اپنی بے وقوفی کی سزا پائی ہے۔ اپنی ہی غلطیوں کے سبب یہ نوبت آئی ہے۔ اب تیری دہائی ہے، تیری دہائی!"

مایوسی کے عالم میں وہ درختوں کے نیچے اِدھر اُدھر چکر کاٹتا رہا۔ دوبارہ بھوک نے ستایا۔ مگر کھانے کے لیے سوائے انجیروں کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ سو اس نے پھر چند پھل کھا لیے، مگر اس بار ایک دوسرے پیڑ سے۔ اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا تو چونک پڑا۔ اس بار کان غائب تھے۔ وہ بھاگتا ہوا چشمے کی طرف گیا کہ پانی میں اپنا عکس دیکھے۔ یہ کیا اسرار ہے؟ پانی میں اپنے عکس پر نظر پڑتے ہی مُک کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اب اس کے کان، ناک اور چہرہ سبھی اصلی حالت پر آ گئے تھے۔ پہلے پیڑ کے پھلوں نے اسے جس حالت کو پہنچایا تھا، دوسرے پیڑ کے پھلوں نے اس حال سے چھٹکارا دلا دیا۔ مُک نے دونوں درختوں سے انجیر توڑ کر الگ الگ جیبوں میں بھر لیے اور واپس اسی ملک کی طرف چل پڑا جسے چھوڑ کر اس جنگل تک آیا تھا۔

سرحد میں قدم رکھتے ہی اس نے اپنا حلیہ بدلا تاکہ کوئی اسے پہچان نہ سکے۔ اس کے بعد شاہی محل کے صدر دروازے کے قریب انجیروں کی دکان لگا لی۔ اسے پتا تھا کہ باورچی ابھی شاہی مطبخ کے لیے پھل ترکاری خریدنے کی خاطر اِدھر سے گزرے گا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ چند لمحوں بعد ہی باورچی اِدھر آتا دکھائی

دیا۔ بے موسم کے انجیر نظر آئے تو اس نے سوچا کہ کیوں نہ بادشاہ کے لیے خرید لے۔ بھاؤ تاؤ کے بعد تھوڑے سے پھل مُک نے اس کے ہاتھ فروخت کردیے۔ باورچی نے ٹوکری سنبھالی کہ فوراً ہی بادشاہ کی خدمت میں یہ نایاب پھل پیش کرے اور انعام پائے۔ ادھر باورچی محل کی سمت چلا، اِدھر مُک نے شہر کی راہ لی۔

بادشاہ اس وقت مہمانوں کے ساتھ خوش گپی میں مگن تھا۔ باورچی نے اسی وقت انجیروں کی ٹوکری بادشاہ کے سامنے رکھی۔ بادشاہ نے تمام مہمانوں میں انجیر تقسیم کیے۔ شہزادوں اور شہزادیوں کو بھی ان کا حصہ دیا۔ سب کے حصے میں دو دو انجیر آئے۔ مزے لے لے کر سب کھانے لگے۔

اتنے میں شہزادی عمارہ کی آواز گونجی: ''ارے ابّی! یہ آپ کی صورت کیسی ہوگئی؟''

چونک کے سب نے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ اس کے سر پر گدھوں جیسے لمبے کان اُگ آئے تھے۔ چہرہ لمبوترا ہوگیا تھا اور ناک پھول گئی تھی۔ پھر سب ایک دوسرے کو حیرت سے تکنے لگے اور پاگلوں کی طرح ہنسنے لگے کہ سبھی کے چہرے ایسے ہی ہوگئے تھے۔

اے عزیزو! ذرا قیاس کرو! کیا حالت ہوئی ہوگی؟ شہر میں

منادی کی گئی کہ کوئی حاذق طبیب آئے اور بادشاہ کے خاندان اور اس کے مہمانوں کو اس قہر سے نجات دلائے۔ بہت سے طبیبوں نے اپنے علاج آزمائے، مگر ناکام واپس آئے۔ ایک شہزادے نے تو خنجر سے اپنے کان اڑا دیے، لیکن ذرا ہی دیر بعد پھر ویسے ہی لمبے بے ڈھنگے کان اُگ آئے۔

ننھا مُک ایک جگہ چھپا ہوا تھا۔ اس تماشے کی خبریں اس کے کانوں تک پہنچ گئیں۔ اس نے جو رقم انجیروں کے عوض باورچی سے حاصل کی تھی، اس سے کپڑوں کا ایک نیا جوڑا خریدا، بھیس بدلا اور محل کی سمت چل پڑا۔ اس نے یہ دعوا کیا کہ وہ مسیح دوراں ہے اور ہر مرض کے علاج کی دوا اس کے پاس ہے۔ پہلے تو کسی کو اس پر یقین نہیں آیا مگر جوں ہی اس نے دوسرے والے پیڑ کا ایک انجیر پیس کر شہزادے کو کھلایا اور اس کی اصلی صورت واپس آئی تو سبھی اس کے سر ہو گئے اور گڑگڑانے لگے کہ ان کا بھی علاج کرے۔ خاص طور سے شہزادیاں بہت پریشان تھیں اور اپنی بدصورتی کے احساس سے شرمندگی کے باعث زمین میں گڑ جاتی تھیں۔

مُک نے ایک ایک کر کے سب کو انجیر کھلائے۔ سب کے چہرے اپنی اصلی حالت پر لوٹ آئے۔ آخر میں صرف بادشاہ بچ رہا۔

بادشاہ نے مُک کا ہاتھ پکڑا اور اسے ساتھ لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں خزانے کی چابیاں لے کر خزانے کی سمت روانہ ہوا۔ خزانے کا دروازہ کھولا اور مُک سے یوں گویا ہوا کہ "اے شخص! کنجیاں تیرے سپرد ہیں۔ یہ ساری دولت تیرے اختیار میں ہے۔ جو کچھ جتنا بھی چاہیے لے لے۔ مگر میری اصلی صورت دے دے۔ میں گدھا بن کر زندہ رہنا نہیں چاہتا۔"

بادشاہ کے الفاظ مُک کے کانوں میں جل ترنگ کی طرح بج اٹھے۔ مُک نے کہا: "چلیے اپنے کمرے میں۔ وہیں چل کر نسخہ تجویز کروں گا۔"

اس کمرے میں مُک نے ایک کونے میں اپنے چپّل دیکھے۔ پاس ہی اس کی جادوئی چھڑی بھی دیوار سے ٹکی ہوئی تھی۔ مُک نے سر جھکا کر کمرے میں چہل قدمی شروع کر دی۔ گویا کہ بادشاہ کے لیے نسخہ تجویز کرنے کی فکر میں ہے۔ بادشاہ اپنے گدھوں جیسے لمبے کان ہلاتا رہا اور دوا کا انتظار رہا۔

اچانک مُک نے چپلوں میں اپنے پاؤں ڈالے اور لپک کر چھڑی بھی اٹھالی۔ پھر بڑی سنجیدگی سے بولا: "اے دروغ گو بادشاہ! تو ناشکر گزار ہے کہ تو نے ایک وفادار خادم کی قدر نہ کی۔ قدر کرنا تو دور رہا تو نے اسے اتنی تکلیفیں پہنچائیں۔ اب تو جانوروں جیسی شکل لیے بیٹھا ہے اور مجھ سے مدد کا طالب ہے۔ مگر تجھے کچھ تو سزا ملنی چاہیے۔ اس لیے میں تجھے اسی حال میں چھوڑتا ہوں اور رخصت ہوتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی مُک نے اپنی ایڑی پر ایک چکر کاٹا اور دل میں یہ خواہش کی کہ شہر سے باہر پہنچ جائے۔ اس خواہش کا دل میں آنا تھا

کہ ہوا میں اڑتا ہوا وہ بادشاہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اے عزیز! وہ دن اور آج کا دن جب سے اب تک ننھا مُنک سکھ چین کی زندگی گزر رہا ہے۔ مگر اسے آدم زاد سے نفرت ہے۔ تجربوں نے اس کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب وہ اپنی تنہائی میں خوش ہے۔

یہی کہانی مجھے میری پدر بزرگوار نے سنائی تھی اور مجھے یہ سوچ کر افسوس ہوا تھا کہ میں نے غریب بونے کو کیوں ستایا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو بھی یہ سارا احوال کہہ سنایا تھا اور سب نے مل کر یہ عہد کیا تھا کہ اب کبھی بھی ننھے مُنک کی ہنسی نہیں اڑائیں گے۔ جب تک وہ زندہ رہا ہم نے اس کے ساتھ کوئی گستاخی نہ کی۔

مَلیح کی کہانی مزے دار بھی تھی اور انوکھی بھی۔ سب کو پسند آئی۔ کچھ سن کر حیران ہوئے، کچھ ہنسے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ سب کے سب اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔ دوسرے روز اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک دن اور اسی کارواں سرائے میں گزارا جائے تاکہ آدمیوں کے ساتھ جانوروں کی بھی تھکن اترے اور آگے کا سفر دشوار نہ محسوس ہو۔ وہ دن بھر قسم قسم کی تفریحات میں مست رہے۔ اچھے عمدہ کھانے کھائے۔ رات کو جب کھا پی کر

ساتھ بیٹھے تو پانچوں سوداگر علی شیزاہ سے بولے کہ ''اے رفیق! اب تو اپنی زندگی کا کوئی واقعہ بیان کر۔''

علی شیزاہ نے یوں جواب دیا کہ ''اے رفیقو! میری زندگی انوکھے واقعات سے خالی ہے۔ اس لیے میں تمھیں ایک درزی شہزادے کی کہانی سناتا ہوں۔''

☆☆☆

درزی شہزادے کی کہانی

سنو دوستو! بات پرانی ہے۔ پھر بھی دلچسپ یہ کہانی ہے۔

کہتے ہیں کہ اگلے زمانے میں ایک ایماندار درزی کی دکان پر ایک کاریگر کام سیکھ رہا تھا۔ نام اس کا البقان تھا۔ اس کے استاد کی گنتی اسکندریہ کے ماہر فن درزیوں میں ہوتی تھی۔

نیا کاریگر نیا تھا، مگر اناڑی نہ تھا۔ تم جانو، ان دنوں مشینیں وشینیں تو تھیں نہیں۔ سارا ہُنر ہاتھ کا ہوتا تھا۔ یہ نیا کاریگر بھی ہاتھ میں سوئی لے کر اس سلیقے سے کپڑوں پر ٹانکے لگاتا کہ لوگ حیرت کرتے۔ اس کے کاڑھے ہوئے گل بوٹوں کو دیکھتے تو تعریفی انداز میں ایک دوسرے کا منہ تکتے۔

نیا کاریگر سست اور کاہل تو نہیں تھا، البتہ اس کی عادتیں کچھ انوکھی ضرور تھیں۔ کبھی اس کے جی میں آتا تو گھنٹوں دَم لیے بغیر سلائی یا کڑھائی کرتا جاتا اور کبھی اے عزیزو! ایسا بھی ہوتا کہ سوئی دھاگہ فرش پر رکھ، اداس صورت، پہروں خالی خالی آنکھوں سے خلا میں گھورتا رہتا۔ کسی سے کچھ نہ کہتا۔ یوں لگتا جیسے آدم زاد نہیں، پتھر کا بُت ہے۔

ایسے موقعوں پر اس کا استاد اور اس کے ساتھی کاریگر دل لگی سے باز نہ آتے۔ اسے طنز کا نشانہ بناتے۔ ہنس ہنس کر خوب ستاتے۔ یک زبان ہو کر کہتے "ہمارا پیارا البقان مفکر ہے۔"

جمعہ کے روز، نماز سے فارغ ہو کر جب لوگ اپنے گھروں کو چلے جاتے اور کھا پی کر آرام کرتے، اس وقت البقان زرق برق پوشاک میں سڑکوں پر مارا مارا پھرتا۔ بہت دنوں کی محنت سے اس نے پیسے جمع کر کے یہ شاندار جوڑا تیار کیا تھا۔

راہ چلتے اگر اس کے ساتھی یا شناسا مل جاتے اور سلام کرتے تو وہ بڑے شاہانہ انداز میں سر کی ذراسی جنبش سے ان کے سلام کا جواب دیتا۔ اس کی اس ادا پر لوگ ہنستے تھے۔ خود اس کا استاد اکثر کہتا کہ البقان کے جسم میں کس شہزادے کی روح چھپی ہوئی ہے۔ البقان اپنے استاد کے اس جملے کا بُرا ماننے کے بجائے اس پر خوش ہوتا تھا۔ گویا کہ وہ جو کچھ سن رہا ہے، سو فیصد سچ ہے۔

دن گزرتے رہے۔ البقان اسی طرح اپنے استاد کی دکان پر کام کرتا رہا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی حرکتیں بعض اوقات عجیب و غریب ہوتی تھیں۔ لیکن وہ چونکہ اپنے کام میں ماہر ہو چکا تھا اور طبیعت کا بھی نیک تھا اس لیئے استاد اس کی حرکتوں کو برداشت کرتا رہا اور اس کی بات کو ہنسی میں ٹالتا رہا۔

ایک روز اسکندریہ کے سلطان کا بھائی، نام جس کا شہزادہ سلیم تھا اس علاقے سے گزرا۔ اس نے اپنا ایک انتہائی قیمتی اور

خوبصورت جوڑا معمولی مرمت کے لیے اسی درزی کا دکان پر بھیجا۔ استاد نے یہ کام البقان کے سپرد کر دیا۔

شام کو جب تمام کاریگر اور خود استاد دکان بند کر کے اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے، البقان کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اس کے دماغ میں اک بات آئی اور پھر سر میں ایسی سمائی کہ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ وہ اپنے استاد کی دکان پر پہنچا، جہاں شہزادہ سلیم کا شاہانہ جوڑا مرمت کے بعد ایک کھونٹی پر ٹنگا ہوا تھا۔ کافی دیر تک وہ اس جوڑے کے سامنے کھڑا اس کے رنگ، اس کی کڑھائی، اس کے ریشم کی نرمی، اس پر ٹنکے ہوئے موتیوں اور جواہرات کی چمک دمک، غرض کہ ایک ایک بات پر دل ہی دل میں داد دیتا رہا اور پھر اس کی طبیعت مچلی۔ اس نے وہ جوڑا اپنے بدن پر چڑھا لیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی ناپ البقان کے تن و توش پر ایک دم ٹھیک آئی تھی۔

"کون کہہ سکتا ہے کہ میں سچ مچ کا شہزادہ نہیں ہوں؟"

دکان میں چاروں طرف لگے ہوئے آئینوں میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے البقان نے خود سے پوچھا۔ "استاد بھی تو یہی کہتے ہیں۔ میرے بدن میں کسی شہزادے کی روح چھپی ہوئی ہے۔"

دھیرے دھیرے اسے یقین ہو چلا کہ وہ شہزادہ ہے۔ یہ قیمتی جوڑا کسی اور کا نہیں خود اس کا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب اسے دنیا کو بتا دینا چاہیے کہ وہ شہزادہ ہے۔ اسے چھوٹے اور معمولی حیثیت کے لوگوں میں نہیں رہنا چاہیے۔

اسی طرح کی اینڈی بینڈی باتیں سوچتا وہ دکان سے نکلا۔ اپنی جمع پونجی اپنی جیبوں میں بھری اور اس وقت جب شہر پر رات پھیل چکی تھی فصیل کے صدر دروازے سے باہر نکل گیا۔

اب وہ اپنے شاندار جوڑے میں جدھر بھی جاتا لوگ مرعوب ہو کر اس کی طرف دیکھتے۔ اس بات پر سب کو حیرانی ہوتی کہ جسم پر پوشاک اتنی قیمتی ہے مگر پیدل مارا مارا پھر رہا ہے۔ لوگ جب اس کا سبب پوچھتے تو وہ گول مول جواب دے کر آگے بڑھ جاتا۔ اس نے سوچا لوگوں کا منہ کرنے کے لے اسے کچھ کرنا چاہیے۔ سو اس نے سستے داموں میں ایک گھوڑا خرید لیا۔ گھوڑا سن رسیدہ تھا مگر فرض شناس اور سنجیدہ تھا۔ اپنے نومشق سوار کو چپ چاپ پیٹھ پر لادے چلتا رہتا۔

ایک دن اپنے گھوڑے پر سوار ٹک ٹک کرتا وہ چلا جا رہا تھا کہ راستے میں ایک گھڑسوار سے اس کی ملاقات ہوئی۔ گھڑسوار

نے جھک کر البقان کو سلام کیا اور اس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ دونوں ساتھ ساتھ سفر کریں۔ باتوں میں راستہ کٹ جائے گا۔ البقان کو اس گھڑسوار کی شکل صورت، انداز واطوار پسند آئے۔ سو اس نے یہ تجویز مان لی اور دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

اجنبی نے اس سے باتوں باتوں میں بہت سے سوال پوچھے۔ وہ کون ہے؟ کہاں کا باشندہ ہے؟ کہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ البقان نے بس اتنا کہا کہ وہ ایک عالی نسب شہزادہ ہے اور تفریحاً سیر کو نکلا ہے۔ اجنبی نے اپنا نام عمر بتایا اور کہا کہ اس کے چچا نے بستر مرگ پر اسے کچھ ہدایتیں دی تھیں۔ انھیں کے مطابق وہ سفر میں ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ ساتھ چلتے، ساتھ رکتے، ساتھ کھاتے پیتے۔ اگلے روز البقان نے عمر سے کہا کہ وہ اسے اپنے سفر کا مقصد بتائے۔ عمر نے جواب دیا کہ اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس کی پرورش قاہرہ کے ایک پاشا الفی بیگ نے کی تھی۔ ابھی کچھ ہی دنوں پہلے الفی بیگ پر دشمنوں نے حملہ کردیا۔ تین گھمسان لڑائیوں کے بعد الفی بیگ نے، جو بُری طرح زخمی ہوگیا تھا اور مرنے کے قریب تھا، عمر پر یہ

راز کھولا کہ عمر اس کے حقیقی بھائی کی اولاد نہیں ہے۔ اس کا باپ ایک بادشاہ ہے، جس نے ایک نجومی کے مشورے پر اسے الفی بیگ کے پاس بھیج دیا تھا۔ اور الفی بیگ نے اس کی پرورش بڑے نازونعم کے ساتھ کی تھی۔ الفی بیگ نے معلوم نہیں کیوں عمر کو اس کے باپ کا نام پتا نہیں بتایا۔ اسے بس یہ حکم دیا کہ وہ اس مہینے کے چوتھے روز، جو اس کی بائیسویں سالگرہ کا دن ہے، الشراجہ کے مقام تک جائے جو سات کوس کے فاصلے پر ہے۔ جب وہ اس مقام پر پہنچے گا تو اسے چار اجنبی ملیں گے۔ وہ ان اجنبیوں کو اپنے منہ بولے چچا الفی بیگ کا عطا کیا ہوا خنجر دے دے گا اور ان سے کہے گا: ''میں وہ ہوں جس کے تم منتظر ہو۔'' اس پر اجنبی یوں گویا ہوں گے: ''اے عزیز! شکر اس خدا کا جس نے تیری حفاظت کی۔'' اور پھر اسے اس کے باپ تک پہنچا دیں گے۔

البقان نے یہ کہانی حیرت سے سنی۔ اسے عمر کی قسمت پر رشک آیا۔ پھر رشک کی جگہ حسد نے لے لی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا: ''تو یہ عمر ایک بادشاہ کی اولاد ہے اور میں...... جو جھوٹ موٹ کا شہزادہ بنا پھرتا ہوں، ایک معمولی آدمی ہوں۔'' البقان اپنی حیثیت اور شکل وصورت کا عمر سے موازنہ کرنے لگا اور اس نے

اندر ہی اندر یہ اعتراف کیا کہ عمر ایک انتہائی حسین و جمیل نوجوان ہے۔ اس کی آنکھیں روشن اور چمکدار ہیں۔ اس کی ناک ستواں ہے۔ رنگ روپ خوب کھلا ہوا۔ دیکھنے ہی سے لگتا ہے کہ اس کا تعلق کسی اونچے خاندان سے ہے۔

عمر نے اپنے دل میں یہ اعتراف تو کر لیا مگر اس کے دماغ میں ایک خیال ہلچل مچانے لگا۔ اس نے سوچا، کیوں نہ وہ کسی ترکیب سے خود عمر کی جگہ لے لے۔

دن بھر وہ یہی سوچتا رہا اور اندر ہی اندر کڑھتا رہا اور دل میں اسی خیال کی چبھن لیے رات آنے پر وہ سو رہا۔ اگلی صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ عمر ابھی سو رہا ہے۔ اس کے چہرے پر گہری نیند کا سکون ہے اور اس کی آنکھوں میں شاید اپنی خوش نصیبی کے دنوں کا خواب سمایا ہوا ہے۔ وہ خنجر جو عمر کو اس کے منہ بولے چچا الفی بیگ نے دیا تھا، عمر کی کمر سے بندھا ہوا ہے۔

البقان نے دھیرے سے وہ خنجر نکال لیا۔ اس کی دھار پر ایک نظر ڈالی۔ پھر سوئے ہوئے عمر کے سینے کی طرف دیکھا۔

عمر کو قتل کرنے کا خیال آتے ہی البقان سر سے پیر تک کانپ گیا۔ اس نے جلدی سے خنجر چھپا لیا اور اس کی جان لینے کے

بجائے لپک کر اس کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ پھر ایک ایڑ لگائی اور یہ جا وہ جا۔ کافی دیر بعد عمر کی آنکھ کھلی اور اس نے البقان کو غائب پایا تو اس پر راز منکشف ہوا کہ البقان نے اسے دھوکہ دیا ہے۔ اس کی جمع پونجی پر ہاتھ صاف کیا ہے اور اب خدا جانے کہاں رفو چکر ہو گیا ہے۔

یہ ماہ رمضان المبارک کا پہلا دن تھا۔ :بھی الشراجہ کے مقام تک پہنچنے کے لیے البقان کے پاس چار دن کی مہلت تھی۔ اگر وہ تیزی سے جائے تو زیادہ سے زیادہ دو دن اس سفر کے لیے درکار ہوں گے۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں عمر اس کا پیچھا نہ کر رہا ہو۔ اس لیے اس نے اپنی رفتار اور بڑھا دی۔ اگلے روز اس وقت، جب بستی میں شام اتر رہی تھی، البقان الشراجہ پہنچ گیا۔

ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اس نے سامنے میدان پر نظر ڈالی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ضمیر نے ملامت کی۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ شہزادہ بننے کی قسمت ساتھ لایا ہے۔ اس خیال نے اس کے ضمیر کو تھپک کر سلا دیا۔

اب وہ جس علاقے سے گزر رہا تھا وہ ویران اور غیر آباد

تھا۔ کھانے پینے کا کچھ سامان اس کے پاس تھا، نہیں تو بھوکوں مر جاتا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ بری طرح تھک چکا تھا۔ پھر رات بھی اب گہری ہو چکی تھی۔ اس لیے اس نے کھجور کے ایک درخت کے نیچے اپنا گھوڑا روکا۔ فرش پر زین بچھائی اور چپ چاپ دراز ہو گیا۔

جوں توں رات گزر گئی۔ صبح ہوئی، پھر دھوپ میں تیزی آنے لگی۔ دوپہر کے قریب البقان نے دیکھا کہ دور کچھ گھوڑے اور اونٹ الشراجہ کی سمت بڑھتے آ رہے ہیں۔ ٹیلے کے پاس پہنچ کر یہ قافلہ رک گیا۔ غلاموں نے خیمے استادہ کیے اور جانوروں کے آگے چارہ ڈال دیا۔ اس قافلے کی تعداد کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ قافلہ یا تو کسی مالدار شیخ کا ہے یا کسی پاشا کا۔ البقان کو یقین ہو چکا تھا کہ یہ قافلہ اسی سے ملاقات کے لیے اس مقام تک پہنچا ہے۔ تو کیا اسے خود اس قافلے والوں تک جانا چاہیے اور انھیں یہ بتانا چاہیے کہ وہ جس نوجوان کے منتظر ہیں، وہ خود ان سے ہم کلام ہے۔ اس نے ایک پل کے لیے یہ سوچا۔ پھر اس کے دماغ نے سمجھایا: "اے عزیز! بے صبری اچھی نہیں۔ ضبط سے کام لے۔ اللہ کا نام لے اور دیکھ آگے کیا ہوتا ہے۔"

البقان نے وہ دن اسی طرح کھجور کے نیچے گزارا۔ قافلے والے اس سے کافی فاصلے پر تھے اور اتنی دور سے اسے شاید دیکھ نہیں سکے تھے۔ اگلا دن ماہ رمضان کا چوتھا دن تھا۔ شاید البقان کی زندگی کا سب سے خوش نصیب دن۔ وہ دن جب وہ ایک معمولی درزی کے بجائے ایک سچ مچ کا شہزادہ بن جائے گا۔ البقان نے اچھی طرح ہاتھ منہ دھویا، پوشاک پر جمی ہوئی گرد جھاڑی، گھوڑے پر سوار ہوا اور "یا علی مدد" کہتا ہوا قافلے والوں کی سمت چل پڑا۔

ایک لمحے کے لیے پھر اسے اس خیال نے ستایا کہ اس نے ایک شرمناک حرکت کی ہے۔ ایک اجنبی معصوم کو دغا دی ہے۔ مگر اس نے اس خیال کو جھٹک دیا اور سوچا اب بات ایسی منزل تک پہنچ گئی ہے جہاں سے واپسی کا تصور بیکار ہے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ پچھتانا لاحاصل ہے۔

البقان ٹیلے کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اترا۔ عمر کا خنجر ہاتھ میں لیا اور قافلے والوں کی جانب قدم بڑھایا۔

وہ تعداد میں چھ تھے۔ ان کے بیچوں بیچ ایک بوڑھا تھا۔ لمبی سفید ریش اور جسم پر قیمتی مرصع زرتار لباس، رعب دار چہرہ، کشادہ پیشانی۔ بوڑھے کے پہلو میں ایک بیش قیمت کشمیری شال

پڑی تھی اور پاس ہی زر و جواہر سے آراستہ پگڑی دھری ہوئی تھی۔ البقان اس کے قریب گیا۔ دو زانو خم ہو کر خنجر بوڑھے کی طرف بڑھایا اور بولا: "میں وہ ہوں جس کے تم منتظر ہو۔"

بوڑھے نے جواب دیا: "اے عزیز! شکر ہے اس خدا کا جس نے تیری حفاظت کی۔" یہ کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ پھر روہانسی آواز میں بولا: "اے عمر! اے فرزند! آ اور اپنے باپ کے سینے سے لگ جا۔"

درزی شہزادہ یہ سن کر مسرور بھی ہوا اور متاسف بھی۔ خوشی اس بات کی کہ اس کا برسوں کا خواب پورا ہوا اور افسوس اس واقعے پر کیا کہ یہ خواب اس کا ایک شرمناک فریب کے بعد پورا ہوا ہے۔ ابھی وہ اس ملی جلی کیفیت میں مبتلا تھا کہ اچانک اس کا دل بیٹھ گیا اور آنکھوں میں ڈر سما گیا۔ بوڑھے کے سینے سے الگ ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ ایک گھڑ سوار غضبناک انداز میں ٹیلے کی سمت بھاگا چلا آ رہا ہے۔ اس نے اپنے گھٹنے گھوڑے کے پہلو میں گڑائے اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ البقان کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ گھوڑا وہی ہے جو اس نے خریدا تھا اور جسے وہ عمر کے گھوڑے کے بدلے چھوڑ آیا تھا اور وہ گھڑ سوار — وہ عمر ہے۔

البقان کی حالت خراب ہونے لگی۔ بڑے جتن کے بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور سوچا کہ کچھ بھی ہو، اب تو اس صورت حال سے نپٹنا ہی ہے۔

ٹیلے کے قریب پہنچ کر عمر ایک چھلاوے کی صورت گھوڑے کی پیٹھ سے اترا۔ غصیلی نظروں سے البقان کی طرف دیکھا اور گھڑک کر بولا: "اے ملعون! رک جا! ابھی تیری خبر لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ بوڑھے سے مخاطب ہوا:

"اے بزرگ! کیا تم نہیں جانتے کہ تمھیں دھوکہ دیا گیا ہے۔ عمر میں ہوں۔ میں وہ ہوں جس کے تم منتظر تھے۔ اور یہ شخص مکار اور عیار ہے۔"

سب سناٹے میں آگئے۔ بوڑھا حیرت زدہ ہوکر کبھی البقان کی صورت دیکھتا کبھی عمر کا منہ تکتا۔ البقان نے چند لمحوں کے بعد خود کو سنبھالتے ہوئے مودّب ہوکر کہا: "اے ابا جان! اس جھوٹے کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ خود مکار اور فریبی ہے۔ عمر یہ نہیں میں ہوں۔ اس نابکار کا نام البقان ہے اور یہ اسکندریہ کے ایک درزی کی دکان پر کام کرتا ہے۔ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ سو اس پر غصے کی جگہ رحم آتا ہے۔"

عمر کی یہ باتیں سن کر البقان اپنے آپے میں نہ رہا۔ گالیاں بکتا عمر البقان پر ٹوٹ پڑا۔ قافلے والوں نے بہ ہزار دقت اسے الگ کیا اور اس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ بوڑھے نے البقان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا: ''اے فرزند! تم سچ کہتے ہو۔ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ یہ نشانی یعنی خنجر ہم نے تمھارے ہاتھوں میں دیکھا تھا۔ اس لیے ہمیں یقین ہے کہ تم سچے ہو۔''

اس کے بعد بوڑھے نے اپنے ملازموں سے کہا: ''اس پاگل نوجوان کے ہاتھ پیر باندھ کر اسے اونٹ کے کجاوے میں بٹھا دو۔ اس کا دماغ چل گیا ہے۔''

عمر اب غصے کے بجائے گریہ کرنے لگا۔ گلوگیر آواز میں بولا: ''میرا دل کہتا ہے کہ آپ میرے والد ہیں اور میں ہی آپ کا فرزند ہوں۔ میں اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں عمر ہوں۔ آپ میری باتیں سن لیں۔ پھر کوئی فیصلہ کریں۔''

بوڑھے نے کہا: ''افسوس! ایسا خوبرو نوجوان، مگر دماغ چل جانے سے بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔''

ایک بار پھر بوڑھا البقان سے بغل گیر ہوا اور سب کے سب، آگے سفر پر چل دیے۔ خوبصورت آراستہ اور صحت مند

گھوڑوں پر سوار یہ قافلہ گھر کی جانب روانہ ہوا۔ اونٹوں پر سامان لدا ہوا تھا اور ایک کجاوے میں بیچارہ عمر، اس کے ہاتھ پیر ڈوریوں سے باندھ دیے گئے تھے۔

یہ تو ظاہر تھا کہ بوڑھا البقان کی بات کو سچ مان بیٹھا تھا اور اس نے البقان کو پسند بھی کیا تھا کیونکہ بار بار وہ محبت آمیز نظروں سے البقان کی طرف دیکھتا اور "فرزند، فرزند" کی گردان کرتا جاتا۔

راستے میں بوڑھے نے البقان کو اتنی طویل جدائی کے اسباب بتائے۔ اس نے کہا کہ اس کا نام سعود ہے اور وہ نشابیہ کا سلطان ہے۔ بہت دنوں تک وہ اولاد کی مسرت سے محروم رہا۔ پھر بڑی دعاؤں کے بعد اس کے گھر میں ایک بیٹے کی ولادت ہوئی۔ نام اس کا عمر تجویز ہوا۔ جب نجومیوں سے اس بچے کا زائچہ بنوایا گیا تو نجومیوں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ بائیس برس کی عمر سے پہلے اگر یہ بچہ اپنے باپ ہی کے ساتھ رہے گا تو ایک دشمن کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ یہ سن کو سلطان سعود کا دل کانپ اٹھا اور سینے پر پتھر رکھ کر اس نے اپنے بیٹے کو اپنے رفیق دیرینہ الفی بیگ کے پاس بھجوا دیا کہ بائیس برس تک وہی اس کی سرپرستی اور حفاظت کرے۔

نشابیہ پہنچنے پر اس قافلے کا پُر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ وہاں

کی رعایا کو پہلے ہی سے سارا قصہ معلوم تھا اور وہ اپنے ولی عہد سلطنت شہزادہ عمر کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔ عوام و خواص سڑکوں پر اُمڈ آئے تھے۔ سارا شہر جگمگا رہا تھا۔ گلیاں اور بازار سب بارونق اور آراستہ، جگہ جگہ پھولوں سے سجے پھاٹک بنائے گئے تھے۔ منڈیروں پر چراغاں کیا گیا تھا اور ہر مکان کے دریچوں پر قیمتی، رنگ برنگے، قالین آویزاں تھے۔ شہر تو شہر گاؤں کے باشندے بھی اپنے ولی عہد سلطنت کے خیر مقدم کی خاطر لمبی مسافتیں طے کر کے آئے تھے۔ ہر طرف میلے کا سماں تھا۔ ڈھول تاشے بج رہے تھے۔ کہیں نٹوں کا تماشا، کہیں بہروپیوں کے سوانگ، کہیں کباب اور تافتان، شیرمال اور باقر خانی کی خوشبوئیں، کہیں حلوے پوری کی سوندھی سوندھی مہک۔ دیگیں کھنک رہی تھیں، سقے کٹورے بجا بجا کر مشکیں سنبھالے پیاسوں کو پانی پلا رہے تھے۔ جگہ جگہ دربار کی جانب سے مٹھائیوں کے دونے تقسیم کیے جا رہے تھے۔ ہر طرف چہچہے تھے اور قہقہے۔ لڑکیاں بجی دھجی شہزادے کو دیکھنے کے لیے بے قرار۔ لچے لفنگے موقع پاتے ہی چھیڑ خانی کو تیار۔ سب خوش تھے اور ایک آواز ہو کر نعرے لگاتے تھے: ''شہزادہ عمر! زندہ باد۔''

البقان کو یہ منظر دیکھ کر جھرجھری سی آ گئی۔ رگ وپے میں ایک نشہ سا دوڑ گیا۔ وہ بڑی شاہانہ تمکنت کے ساتھ اپنی رعایا کی جانب سے پھول اور ہار قبول کرتا اور انھیں خوش کرنے کے لیے ایک دو ہار ذرا ذرا سے وقفے کے بعد کسی کم سن لڑکے یا لڑکی کی جانب اچھال دیتا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مستقل مسکراہٹ تھی۔

اُدھر وہ غریب کجاوے میں دھنسا اپنی قسمت پر دل ہی دل میں آنسو بہا رہا تھا۔ یہ سارا جشن اس کے لیے تھا۔ مگر سب اس بات سے بے خبر تھے کہ اصل شہزادہ اور ولی عہد سلطنت وہ مکار نہیں جو لوگوں کی سلامیاں قبول کر رہا ہے، بلکہ ایک بدنصیب قیدی ہے جو ایک اونٹ کے کجاوے میں چھپا، یہ سارا شور سن رہا ہے اور غصے اور رنج سے بھن رہا ہے۔

....

آخر کار جلوس راجدھانی پہنچ گیا۔ یہاں تو جشن کا سماں اور بھی نرالا تھا۔ ہر طرف چہچہے، قہقہے۔ محل کے دربار ہال میں خیر مقدم کی تیاریاں کی گئی تھیں۔ تمام کا تمام فرش خوش رنگ دبیز قالینوں سے ڈھکا ہوا، دیواروں پر تصویریں آویزاں، جھاڑ اور فانوس سے سارا ہال بقعۂ نور، چاندی سونے کے تاروں اور موتی

کی جھالروں سے ساری فضا جگمگ جگمگ۔ منظر ایسا دلربا کہ آنکھ ٹھہرنا محال۔ شام ہوتے ہی سیکڑوں چراغ روشن کردیے گئے۔ رات پر دن کا گمان ہونے لگا۔ ملکۂ معظّمہ خواصوں میں گھری ایک زریں تخت پر رعب سے بیٹھی تھیں۔ ان کے سر پر چار امرا نے ایک ریشمی چادر تان رکھی تھی۔ ایک خادمہ مورچھل ہلا رہی تھی۔

ملکہ کو اپنے ذی وقار شوہر اور ہونہار فرزند کا انتظار تھا۔ انھوں نے جس روز فرزند کو جنم دیا اسی دن اس سے جدا کردی گئیں۔ کبھی کبھار خواب میں ایک موہنی سی صورت انھوں نے دیکھی تھی اور اسی کو اپنا بیٹا جانا تھا۔ خواب میں دیکھی صورت آنکھوں میں ایسی رچ بس گئی تھی کہ ہزاروں کے مجمع میں اسے پہچان سکتی تھیں۔ انھوں نے جلوس کی آمد کا شور سنا اور مسکرائیں۔ اُدھر محل کے احاطے میں انار پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ پٹاخے دغے، سنگ مرمر کی راہداری میں قدموں کی آواز گونجی۔ ہال کے دروازے کھول دیے گئے۔ محافظوں کے دستے نے فرش پر دوزانو ہوکر "مبارک، سلامت" کی صدائیں بلند کیں۔ پھر ہر طرف سے یہی آوازیں آنے لگیں۔

سلطان کا چہرا کھلا ہوا تھا۔ انھوں نے ایک ہاتھ میں اپنے

فرزند کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ ملکہ معظّمہ کے قریب پہنچ کر بولے: "یہ لیجیے! آپ کا بیٹا آپ کے حضور میں ہے۔" یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ آواز روہانسی ہوگئی۔

ملکہ نے چونک کر نوجوان کی طرف دیکھا۔ ایک پل کو اپنی پلکیں جھپکائیں اور جھٹ سے بولیں: "مگر یہ تو میرے بیٹے کی صورت نہیں ہے۔ اس کی تو کایا ہی کچھ اور ہے۔"

ابھی لوگ ملکہ کی اس بات پر حیران، پریشان، گم سم کھڑے تھے کہ اچانک ہال کے ایک دروازے سے عمر اندر گھسا۔ وہ اپنے محافظ سپاہیوں کے حلقے سے کسی طرح بھاگ نکلا تھا۔ اس عزیز نے اپنے آپ کو سلطان کے قدموں میں ڈال دیا اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔ پھر یوں گویا ہوا کہ "اے پدر بزرگوار، میری جان لے لیجیے، ایسی کٹھور سزا مجھے نہ دیجیے۔ میں کب تک یوں ہی چپ رہوں۔ کب تک یہ ذلّت سہوں؟"

لوگ بھونچکے ہوکر اس غریب کے گرد سمٹ آئے۔ محافظ دوڑے کہ اسے پکڑیں۔ سلطان نے اونچی آواز سے کہا: "بکو مت۔ میری آنکھوں میں دھول مت جھونکو۔ میرا بیٹا وہی ہے جس پر میری نگاہ ٹکی ہے۔ میں تمھارے قریب بھی نہیں آسکتا۔"

پھر اس نے حکم دیا کہ اس مکار کو گرفتار کر لیا جائے اور چلاّ کر بولا: ''یہاں میرا لفظ قانون ہے، ملکہ معظّمہ کی باتوں پر نہ جاؤ۔ وہ بہت ضعیف الاعتقاد ہیں اور خواب کی بات پر ایمان لائی ہیں۔ مگر میرا بیٹا وہی ہے جو ثبوت فرزندی کے طور پر نشانی والا خنجر لے کر مجھ تک پہنچا ہے۔''

''اے بزرگ! وہ آپ کا فرزند نہیں چور ہے۔ اس نے مجھ غریب کو دھوکہ دیا ہے۔'' عمر نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس پر بھی سلطان کا دل نہ پسیجا۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس گستاخ کو بیڑیوں میں جکڑ کر لے جایا جائے اور قید خانے میں ڈال دیا جائے۔ پھر وہ البقان کو ساتھ لے کر ہال سے باہر نکل گیا۔

ملکہ معظّمہ کا دل ٹوٹ گیا۔ انھیں یقین تھا کہ ان کا فرزند البقان نہیں بلکہ وہ غریب عمر ہے۔ خواب میں جو صورت انھیں نظر آتی تھی، عمر عین مین اسی کی مورت تھا۔ وہ دیر تک گریہ کرتی رہیں، آہیں بھرتی رہیں۔ جب دل کو ذرا قرار آیا انھوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اپنے ضدی شوہر کو کس طرح قائل کریں؟ اے رفیقو! عورت ذات بچاری، مامتا کی ماری، اندر ہی اندر کڑھتی رہی۔

سلطان کے ساتھ جو ملازم ان کے بیٹے سے ملاقات کے

لیے گئے تھے اور جن کے سامنے البقان نے وہ خنجر سلطان کے سامنے پیش کر کے اپنی فرزندی کا ثبوت مہیا کیا تھا، ملکہ نے انھیں بلوایا اور ان سے ساری تفصیل پوچھی۔ ملازموں نے سارا حال کہہ سنایا کہ کس طرح سلطان نے اپنے بیٹے سے ملاقات کی اور وہاں عمر نے آکر اچانک کس طرح البقان کو پل بھر میں حیرانی میں ڈال دیا اور یہ دعوا کیا تھا کہ خنجر کا مالک البقان نہیں بلکہ خود عمر ہے۔ البقان کے بارے میں عمر نے یہ کہا تھا کہ وہ تو ایک نیم دیوانہ درزی ہے۔

ملکہ کے ساتھ اس وقت ان کا مقرب خاص مالک شاہ بھی موجود تھا۔ مالک شاہ بہت دانا مشہور تھا اور ذرا سی دیر میں، بات کی تہہ تک پہنچنے میں کمال رکھتا تھا۔ اس نے جب یہ احوال سنا تو ملکہ سے کہا: ''اب آپ اپنے دل کو سنبھال لیں۔ ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔ خدا نے چاہا تو اصل حقیقت سامنے آجائے گی۔ نیکی فتح یاب ہوگی اور بدی اپنی کرنی کا پھل پائے گی۔'' پھر اس نے ملکہ کے کان میں چپکے چپکے کوئی بات کہی اور باہر نکل گیا۔

ملکہ بھی بہت سمجھ دار عورت تھیں۔ انھیں یقین تھا کہ یہ ترکیب کارگر ہوگی۔ سو اب انھوں نے اپنا رویہ بدلا۔ رونا دھونا

چھوڑا اپنی اصلی حالت پر آ گئیں اور ایسا سوانگ بھرا جیسے انھیں اپنے شوہر کی رائے سے اتفاق ہو اور وہ البقان ہی کو اب اپنا فرزند سمجھ رہی ہوں۔

سلطان کو اس بات پر خوشی ہوئی۔ ایک روز ملکہ نے سلطان سے لگاوٹ کی باتیں کرتے کرتے اچانک کہا: ''کیوں نہ اس قصے کو حل کرنے کے لیے عمر اور البقان دونوں کا امتحان کیا جائے۔''

''کیسا امتحان؟'' سلطان نے پوچھا۔

''یہ دیکھا جائے کہ دونوں میں زیادہ ہنرمند کون ہے؟ شہ سواری، تیغ زنی تو سبھی جانتے ہیں۔ میں تو دونوں سے یہ کہوں گی کہ ایک ایک چغہ سی کر دکھائیں اور اس پر گل بوٹے بنائیں۔''

سلطان کو یہ سن کر حیرانی ہوئی کہ بھلا یہ کیا امتحان ہوا؟ مگر ملکہ کی باتوں میں آ گیا اور دل میں سوچا کہ ملکہ کو خوش کرنے کے لیے یہ تماشا بھی سہی۔ ویسے اتنا ضرور کہا کہ ''بھلا فرزند شاہ سلائی کڑھائی کیا جانے؟ ظاہر ہے کہ اس امتحان میں وہ ہار جائے گا۔''

اے رفیقو! اس کے بعد سلطان اپنے بیٹے کے پاس گیا اور اس سے کہا تمھاری ماں چاہتی ہیں کہ ایک چغہ تم اس کے لیے

سی کر دکھاؤ اور اگر گل بوٹے بنا سکو تو بناؤ۔ اپنی ہنرمندی کی داد پاؤ۔ ہر چند کہ یہ تمھاری شان کے شایان نہیں پھر بھی ماں کی ضد ہے۔ پوری کرنی ہی ہوگی۔"

البقان دل ہی دل میں خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے سوچا کہ شاید اس طرح ملکہ کا دل جیتنے کی ایک بہترین صورت ہاتھ آئی ہے۔ بولا: "بسر و چشم اس حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہوں۔"

البقان اور عمر دونوں الگ الگ کمروں میں بٹھا دیے گئے۔ سوئی، دھاگہ، قینچی، ریشمی کپڑے کا ایک ایک تھان دونوں کو دے دیا گیا۔

سلطان یہ سوچ کر حیران تھا کہ خدا جانے اس کا فرزند اس تھان کا کیا حشر کرے گا۔ بہرحال اس کام کو پورا کرنے کے لیے دو روز کا موقع دونوں کو دیا گیا تھا۔ ملکہ بڑی بے چینی کے ساتھ تیسرے دن کے انتظار میں تھی۔

خدا خدا کر کے تیسرا دن آیا۔ البقان نے بہت شاندار چغہ تیار کیا۔ بڑے گھمنڈ سے سینہ پھلائے ملکہ کے حضور میں آیا۔ چغہ انھیں دکھایا اور بتایا کہ یہ ہنر سارے کا سارا اسی کا ہے۔ مشاق کاریگر دیکھے گا تو پانی بھرے گا۔ گل بوٹے ایسے بنائے ہیں جیسے

چمن سے تازہ تازہ آئے ہیں۔

سلطانہ دھیمے سے مسکرائیں اور چغہ لے لیا۔ پھر عمر کو بلوایا گیا۔ عمر آیا اور ریشمی تھان بغیر سلے جوں کا توں اپنے ساتھ لایا۔ تھان اور قینچی فرش پر دے ماری۔ ناگواری سے بولا: ''میں چھلانگیں لگا سکتا ہوں۔ خندقیں پار کر سکتا ہوں، تیر تلوار چلا سکتا ہوں، گھوڑے کی سواری کا کمال دکھا سکتا ہوں مگر اے بزرگوار، میں نے سوئی دھاگہ اس سے پہلے کبھی چھوا بھی نہیں۔ الفی بیگ نے مجھے یہ تربیت دینے کی سوچی ہی نہیں۔ سو یہ کپڑا اور سوئی دھاگہ واپس کرتا ہوں۔''

ملکہ چیخ پڑیں۔ دوڑ کر عمر سے لپٹ گئیں اور گریہ کرتے ہوئے بولیں: ''بیشک تم ہی ہمارے فرزند ہو۔''

اتنا کہہ کر ملکہ نے سلطان کی جانب دیکھا، بولیں: ''سرتاج! گستاخی معاف ہو۔ میں نے یہ تماشا اس لیے کروایا تھا کہ حقیقت کا حال کھلے، سو کھل گیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ان دونوں میں شہزادہ کون ہے اور درزی کون؟ آپ کے منہ بولے فرزند نے جو چغہ تیار کیا ہے بلاشبہ وہ بے مثال ہے۔ ذرا اس سے یہ تو پوچھیے کہ اس نے یہ ہنر کیسے سیکھا؟''

اس بات پر سلطان دم بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ ایک نظر ملکہ پر ڈالی، ایک البقان پر۔ البقان کا چہرہ شرم اور غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ چلا کر بولا: ''اے بزرگوار! یہ میری توہین ہو رہی ہے۔ آخر ایسا کس لیے ہے؟ میں جو کام کروں سلیقے سے کرتا ہوں۔ والدہ معظّمہ سے کہیے کہ مجھے یوں ذلیل نہ کریں۔''

سلطان نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا: ''بس اتنا سا ثبوت کافی نہیں ہوسکتا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بلاوجہ کے شک کی شکار ہیں۔ خیر میں اس سے بھی بہتر ایک اور طریقے سے امتحان لوں گا۔''

اتنا کہہ کر سلطان کمرے سے نکل گیا۔ ایک گھوڑا منگوایا۔ لپک کر اس کی پیٹھ پر جا بیٹھا اور ایڑی لگائی۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

سلطان کا رُخ ایک جنگل کی سمت تھا جہاں ایک روایت کے مطابق ایک پری عدل زائیدہ کا قیام تھا۔ یہ بات بھی مشہور تھی کہ پری عدل زائیدہ آڑے وقتوں میں سب کے کام آتی ہے۔ بگڑی بناتی ہے۔ اب سے آگے بھی سلطان کے بزرگوں نے اس سے کچھ معاملوں میں مدد چاہی تھی۔

جنگل شہر سے بہت دور نہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں سلطان منزل مقصود پر جا پہنچا۔ جنگل کے وسط میں ایک صاف شفاف گھر دیکھ کر ٹھہر گیا۔ ایک پیڑ کے تنے سے گھوڑے کی لگام باندھی اور پکار کر بولا: "اے بُرے وقتوں میں کام آنے والی پری زائیدہ! تم کہاں ہو؟ جہاں ہو، میری آواز سن کر اِدھر آؤ۔ مدد کا ہاتھ بڑھاؤ۔"

ابھی وہ چپ ہوا ہی تھا کہ ایک درخت کی اوٹ سے سفید برّاق لباس پہنے، چہرے پر نقاب ڈالے پری نمودار ہوئی۔ نرمی سے بولی: "اے سعود! تیری صدا کے جواب میں تیرے سامنے ہوں۔ بول کیا چاہتا ہے؟"

سلطان نے اپنی بپتا کہہ سنائی۔ پری نے دو طوق سلطان کے حوالے کیے۔ کہا: "لے! یہ دونوں طوق ان کے سامنے لے جا۔ ان میں جو بھی تیرا بیٹا ہوگا صحیح طوق کا انتخاب کرے گا۔"

بس اتنا کہہ کر پری لپک جھپک درختوں کی اوٹ میں چھپ گئی۔ سلطان نے غور سے وہ دونوں طوق دیکھے۔ دونوں بیش قیمتی ہاتھی دانت کے بنے ہوئے تھے۔ ان پر چاندی سونے کا کام تھا۔ موتی جڑے ہوئے تھے۔ ایک پر یہ الفاظ کندہ تھے: "عزت

اور وقار۔'' دوسرے پر یہ الفاظ تھے: ''مسرت اور دولت۔''
سلطان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کون سا طوق بہتر ہے؟ پری غائب ہو چکی تھی۔ اس لیے مزید کچھ پوچھنے کی صورت نہ تھی۔ ناچار دونوں طوق ساتھ لے کر گھوڑے پر سوار ہو محل کی سمت چل پڑا۔

محل واپس آنے کے بعد سلطان نے ملکہ کو طلب کیا۔ آپ بیتی سنائی۔ طوق ملکہ کو دکھائے۔ ملکہ کا جی اندر ہی اندر خوش ہو اٹھا۔ انھیں یقین تھا کہ اب فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔

سلطان کے حکم سے امتحان کی تیاریاں مکمل کی گئیں۔ تخت شاہی کے سامنے دو میزوں پر دونوں طوق رکھ دیے گئے۔ سلطان تخت پر جا بیٹھا۔ امرا وزرا صف بہ صف اندر آئے اور اپنی مقررہ جگہوں پر سر نیہوڑائے بیٹھ گئے۔ پہلے البقان کو اندر بلایا گیا۔ وہ بڑے کرّ و فر کے ساتھ ہال میں داخل ہوا۔ سب کی نگاہیں ایک ساتھ اس کی جانب اٹھیں۔ وہ بڑے انداز سے اینڈتا ہوا تخت شاہی کے قریب پہنچا اور بولا:

''حضور بزرگوار! آپ نے اپنے فرزند کو اس وقت کاہے کو طلب کیا ہے؟''

سلطان نے اٹھ کر اسے گلے سے لگایا۔ پھر بتایا کہ

"اے بیٹے! تمھارے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ خود تمھاری والدہ معظّمہ بھی شک میں مبتلا ہیں۔ شک کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ مگر پری زائیدہ کی بات اور ہے۔ ہمارے بزرگوں نے ہمیشہ ان سے مدد پائی ہے۔ پری زائیدہ نے دو طوق دیے ہیں۔ ان میں ایک چن لو۔ بس یہی امتحان ہے۔ میری دعا ہے کہ تم اس امتحان میں پورے اترو اور شک کا منہ کالا ہو۔"

البقان نے ایک ایک کر کے دونوں طوق دیکھے۔ پل بھر کو کسی سوچ میں کھویا رہا۔ پھر یوں گویا ہوا کہ "اے باپ جان! میں آپ کا فرزند ہوں۔ آپ کا فرمان میرا ایمان ہے۔ تعمیل حکم میں ایک طوق چنے لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک طوق اٹھالیا جس پر "مسرت اور دولت" کے الفاظ کندہ تھے۔

سلطان نے وہ طوق غور سے دیکھا۔ پھر اسے اس جگہ رکھ دیا اور عمر کی طلبی کا حکم صادر کیا۔ عمر آیا۔ غمگین اور پریشاں رو۔ آنکھوں میں درد بھرا ہوا۔ چہرہ بے خوابی کے باعث ستا ہوا۔ اہل دربار کا دل اسے دیکھ کر پسیج گیا۔ عمر نے تخت شاہی کو بوسہ دیا پھر پوچھا: "اس بدنصیب کو کس لیے طلب کیا گیا ہے؟"

سلطان نے پھر وہی بات دہرائی کہ: ''جا اور ایک طوق چن لے۔''

عمر آگے بڑھا۔ ایک نظر دونوں پر ڈالی اور وہ طوق جس پر ''عزت اور وقار'' کے الفاظ کندہ تھے، اٹھالیا۔ دکھ بھرے لہجے میں بولا: ''اے بزرگوار! مجھے زندگی کا جو تجربہ ملا ہے اس سے یہ بھید مجھ پر کھلا ہے کہ مسرت اور دولت کے لیے آدمی ایمان بیچ دیتا ہے۔ سو میں نے اس کی طرف سے اپنی آنکھیں پھیر لی ہیں۔ البتہ عزت اور وقار نہ چرایا جا سکتا ہے، نہ چھینا جا سکتا ہے۔ سو میں نے اسی کا انتخاب کیا۔''

اب سلطان نے البقان کو حکم دیا کہ وہ میز کے قریب جا کر اس طوق پر ہاتھ رکھے جس کا اس نے انتخاب کیا تھا۔ پھر اس نے خادموں کو حکم دیا کہ زمزم سے بھری صراحی لے آئیں۔ خادموں نے تعمیل کی۔ سلطان نے مشرق کی طرف رُخ کر کے، دوزانو بیٹھ کر یہ دعا مانگی:

''اے خداؤں کے خدا! تو سب سے بڑا ہے اور ہمارے ناموس کا محافظ ہے۔ ان دونوں میں جو بھی سچا ہے اسے اپنی امان میں رکھ اور بتا کہ کون سچا ہے؟ تو ہی

سارے بھیدوں کا جاننے والا ہے۔"

بارگاہِ خداوندی میں اس دعا کے بعد سلطان پھر اپنے تخت پر جا بیٹھا۔ سارے دربار پر ایک سناٹا طاری تھا۔ سب کا دل بھاری تھا۔ تمام اہل دربار اسی سوچ میں تھے کہ اب آگے اور کیا ہونے والا ہے؟

سلطان ایک ٹک ان دونوں طوقوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک کھٹکا سا ہوا اور ایک طوق کا ڈھکنا آپ ہی آپ کھلا۔ اس ڈھکنے سے ایک شبیہ نکلی جس پر تاج شاہی کا عکس تھا۔ یہ طوق عمر نے چنا تھا۔ چند لمحوں بعد البقان نے جس طوق کا انتخاب کیا تھا اس کا ڈھکنا کھلا۔ اس میں سے ایک سوئی اور دھاگہ نکلا۔

سلطان نے حکم دیا کہ وہ شبیہ لائی جائے۔ سلطان نے اس پر ہاتھ رکھا اور رفتہ رفتہ تاج کا عکس ایک سچ مچ کے تاج میں منتقل ہو گیا۔ پھر اس کا حجم بڑھنا شروع ہوا اور ذرا دیر بعد وہ اتنا بڑا ہو گیا کہ آسانی سے سر پر رکھا جا سکے۔

اہل دربار نے مبارک سلامت کی صدائیں بلند کیں۔ سلطان نے وہ تاج اپنے ہاتھوں سے عمر کے سر پر رکھ دیا۔ ملکہ معظمہ فوراً سربسجود ہو گئیں۔ شکر اس خدا کا ادا کیا جو ہر بھید کا جاننے

والا ہے۔ جس کا رنگ ڈھنگ سب سے نرالا ہے اور جس کے انصاف کی وجہ سے دنیا میں سچ کا بول بالا ہے۔

عمر نے آگے بڑھ کر سلطان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر اپنی والدہ معظّمہ کے سینے سے جا لگا۔ اہلِ دربار خوش ہوا ٹھے کہ وہی ہوا

جس کے وہ دل سے آرزومند تھے۔ البقان چپّی مارے، کھسیایا اور روہانسا کھڑا تھا۔

سلطان نے اسے اب قریب آنے کا حکم دیا۔ سوئی اور دھاگہ اس کے حوالے کیا اور کہا: "لے! جو تیرا تھا، تیرے پاس پہنچ گیا۔ اے ناہنجار! تو نے جو فریب رچایا تھا۔ اس کی سزا تو یہی ہے کہ تیری گردن ماردی جائے۔ مگر میں آج اپنے اصل فرزند کو پانے کی خوشی میں تیری جان بخشتا ہوں۔ اب میرا حکم یہ ہے کہ ابھی، اسی وقت دُم دبا کر یہاں سے کھسک جا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا جلال رحم پر غالب آجائے اور تو اپنے کیے کی سزا پائے۔"

....

مارے شرم کے البقان کا بُرا حال ہوگیا۔ جینا وبال ہوگیا۔ دھڑام سے شہزادے کے قدموں میں گرا۔ پیروں کو بوسہ دیا۔ گریہ کیا اور بولا: "اے لائق شہزادے! میری خطا معاف کر۔"

شہزادے نے اسے دونوں ہاتھوں سے سہارا دے کر اٹھایا۔ گلے سے لگایا اور کہا: "جا، خدا تجھے معاف کرے۔ آئندہ کے لیے توبہ کر اور یہ جان لے کہ دوستی کے نام پر وفاداری، دشمنوں کے تئیں رواداری ہی مردوں کی پہچان ہے۔ یہی میرا ایمان ہے۔

میں تیری خطا معاف کرتا ہوں۔"

سلطان یہ سن کر اشکبار ہوا۔ اپنی غلطیوں کو سوچ کر بے قرار ہوا اور بولا: "اے فرزند! تو نے بڑے دکھ اٹھائے، مگر سچ مچ تجھ میں رئیسوں کی شان ہے۔ شرافت کی یہی پہچان ہے کہ تو اپنے دشمن کو بھی سینے سے لگاتا ہے۔"

یہ کہہ کر سلطان شہزادے کے سینے سے جالگا۔ خوب رویا۔ امیروں، وزیروں اور مصاحبوں نے یک زبان ہو کر نعرہ لگایا: "شہزادے کی عمر دراز ہو۔"

سب خوشی سے چلانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجمع کا رنگ بدل گیا۔ اس نیچ البقان چپکے سے وہ طوق بغل میں دبائے باہر نکل گیا۔

وہ سب کی نظریں بچا کر سلطان کے اصطبل میں گھسا۔ ایک گھوڑے پر سوار ہوا اور اسکندریہ کی سمت بھاگ کھڑا ہوا۔ اب اسے وہ دن جب اس نے شہزادے کا سوانگ بھر رکھا تھا، خواب سے لگتے تھے۔ بس ایک قیمتی طوق اس کے پاس تھا، جس پر ہیرے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔

....

اسکندریہ پہنچ کر وہ سیدھا اپنے پرانے مالک، اپنے استاد درزی کے پاس پہنچا۔ گھوڑے سے جھٹ پٹ اتر کر دکان میں داخل ہوا۔ پہلے تو بوڑھے درزی نے اسے پہچانا ہی نہیں اور اسے کوئی نیا گاہک سمجھ کر بڑی عزت کے ساتھ بٹھایا۔ شربت سے تواضع کی۔ مگر چند لمحوں بعد اس نے اسے پہچان لیا اور دکان کے دوسرے ملازموں کو آواز دی۔ سب لپکے ہوئے آئے۔ البقان کو دیکھتے ہی سب نے کانا پھوسی کی۔ پھر اچانک ایک ساتھ سب کے سب اس پر ٹوٹ پڑے۔ بُری طرح اس کی مرمت کی۔ اس کے بازوؤں میں سوئیاں چبھودیں، قینچی سے اس کے بال جہاں تہاں تراش دیے۔ خوب لات گھونسے جمائے۔ یہاں تک کہ بیچارا بے ہوش ہوکر پرانے کپڑوں کے ایک ڈھیر پر گر پڑا۔

دوبارہ ہوش میں آیا تو استاد نے بتلایا کہ یہ سب چوری کی سزا ہے۔ البقان ایک عمدہ جوڑا لے کر وہاں سے بھاگا تھا۔ سو آج اس کی سزا پائی۔ اپنی رہی سہی عزت گنوائی۔ البقان نے بات بنائی۔ بولا: ''آج اس چوری کا معاوضہ ادا کرنے کی خاطر ہی تو وہ آیا تھا۔ تس پر استاد درزی اور اس کے کاریگر ایک بار پھر اس پر ٹوٹ پڑے۔ اسے اچھی طرح مار پیٹ کر دکان سے باہر پھینک دیا۔

بولے: ''اے ناہنجار! چوری کر کے تو نے ہم سب کو ذلیل کیا۔ اب پچھتاوے سے کیا ہوتا ہے۔ جا دفعان ہو۔''

ناچار البقان دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ ایک سرائے کی راہ لی۔ وہاں بستر پر گر کر اپنی حالتِ زار پر رونے لگا۔ دل ہی دل میں یہ عہد کیا کہ اب آگے کبھی دوسرے کی دولت یا جھوٹی عزت کی خاطر یوں رسوا نہ ہوگا۔ یہ سوچتا سوچتا وہ سو گیا۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو پچھلی شام کی پٹائی یاد آئی۔ اس نے پھر یہ بات دل ہی دل میں دہرائی کہ اب عزت کی روزی کمائے گا اور روکھی سوکھی کھائے گا۔ اس نے اپنا طوق اونچے داموں ایک جوہری کے ہاتھ بیچ دیا۔ ایک مکان خریدا اور درزی کی ایک دکان کھول لی۔ یہ ساری تیاریاں مکمل ہو چکیں تو دکان پر سیاہ روشن حروف میں ایک بورڈ لگوایا۔ بورڈ پر لکھا تھا: ''البقان درزی کی دکان۔'' اسی طوق سے جو سوئی اور دھاگہ برآمد ہوا تھا اس سے پھٹے ہوئے کپڑوں کی مرمت کی۔ پٹائی کی وجہ سے اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ اتنے میں کسی نے اسے باہر سے پکارا۔ وہ کام چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ واپس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ طوق سے نکلی ہوئی وہ سوئی آپ ہی آپ کپڑے پر چلی جا رہی ہے

اور ایسی عمدہ سلائی کر رہی ہے کہ اچھے سے اچھے کاریگر کے بھی ہوش اڑ جائیں۔ یہ تو ہوا اس سوئی کا حال۔ دوسری طرف وہ دھاگہ بھی عجیب تھا کہ کس طرح ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ البقان نے گھنٹوں اس دھاگے کو استعمال کیا، مگر وہ ختم نہ ہوا۔

ہوتے ہوتے اس بات کا چرچا باہر ہونے لگا۔ لوگوں نے جب سنا کہ البقان کے پاس ایک جادوئی سوئی ہے جو عمدہ سے عمدہ سلائی کرتی ہے، تو جوق در جوق اس کی دکان پر جمع ہونے لگے۔ اسے دھڑا دھڑ کام ملنے لگا۔ بہت جلد وہ اس علاقے کا سب سے مشہور درزی بن گیا۔ وہ کپڑے تراش کر بس ایک ٹانکہ اپنے ہاتھ سے لگاتا۔ بقیہ سارا کام سوئی خود کرتی۔ یہاں تک کہ سلائی مکمل ہو جاتی۔ البقان کے نام کا سارے اسکندریہ میں ڈنکا بجنے لگا۔ البقان نے کوئی کاریگر ملازم نہیں رکھا۔ اسے ضرورت بھی کیا تھی؟ لوگ یہ تو جان گئے تھے کہ البقان کی سوئی جادو کی ہے اور اس کی سلائی کا کوئی دوسرا کاریگر مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مگر انھیں یہ پتا نہ تھا کہ سوئی بغیر ہاتھ لگائے خود بخود چلتی رہتی ہے۔ البقان نے بھی اس راز کو راز ہی رکھا۔ وہ سلائی کا کام اکیلے، دکان کا دروازہ بند کرنے کے بعد کرتا تھا۔

سوائے عزیزو! اس طوق پر جو لفظ کندہ تھے یعنی ''مسرت اور دولت'' وہ سچ نکلے۔ البقان کو خوشی بھی ملی اور دولت بھی۔ کبھی کبھار اس کے کانوں تک شہزادہ عمر کی فتوحات اور نیکیوں کی خبریں بھی پہنچتیں تو وہ سوچتا: ''جو جس کے لیے تھا اسے مل گیا۔ مگر 'عزت اور وقار' خطرناک چیزیں ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اب اپنے حال پر خوش ہوں۔''

....

سورج غروب ہوتے ہی قافلہ آگے سفر پر چل پڑا۔ اس کے بعد جو مقام آیا اس کا نام برکت الاحد تھا۔ اس مقام سے قاہرہ کا فاصلہ کل تین کوس تھا۔ قافلے کی آمد کی خبر شہر میں پہنچ گئی تھی۔ دوست، احباب قافلے والوں کا خیر مقدم کرنے کے لیے گھروں سے باہر نکل آئے۔ قافلہ باب الفتح میں داخل ہوا۔ شہر کے بڑے چوراہے پر چارترکی سوداگروں نے سلیم اور یونانی سوداگر زالیوکوس سے رخصت طلب کی اور اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ زالیوکوس اجنبی کو ایک عمدہ سرائے تک لے گیا اور اسے اپنے ساتھ ایک وقت کے کھانے کی دعوت دی۔ سلیم نے دعوت قبول کی اور کہا کہ: ''وہ ذرا لباس تبدیل کر لے، پھر آتا ہے۔''

زالیوکوس نے بطور خاص ہدایت دے کر عمدہ عمدہ کھانے پکوائے۔ مشروبات کا اہتمام کیا۔ پھر دسترخوان بچھا اور اس پر ساری چیزیں سجادی گئیں۔ زالیوکوس اپنے اجنبی دوست سلیم کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بھاری قدموں کی چاپ سن کر کھڑا ہوگیا۔ دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہے کہ سلیم کے بجائے وہی چغے والا پُراسرار آدمی سامنے کھڑا ہے۔ آنکھیں نقاب میں چھپی ہوئی، مگر عین مین وہی ڈیل ڈول اور وہی جانا پہچانا چغہ اس کے بدن پر ہے۔

زالیوکوس اپنی زندگی کے سب سے دردناک واقعے کو یاد کرکے کانپ اٹھا۔ سارے غم نئے سرے سے تازہ ہوگئے۔ چیخ کر بولا: ''تم منحوس، تم پھر میرے پاس آگئے۔''

چغے والے نے دھیمے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا: ''اے زالیوکوس! سوچو تو، یہ کیسا خیر مقدم ہے؟'' یہ کہتے کہتے اس نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھائی اور زالیوکوس کے حلق سے دبی دبی آواز نکلی۔ ''تو یہ تم ہو! سلیم''

زالیوکوس کا دل اندر سے کانپ رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اس نے خود کو سنبھالا۔ سلیم کو دسترخوان پر بٹھایا اور چپ چاپ کھانا

کھانے لگا۔

سلیم نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا، پھر بولا: ''میں تمھارے چہرے سے تمھارے دل کا حال پڑھ سکتا ہوں۔ شاید یہی بہتر ہوتا کہ میں تمھاری نظر میں سلیم ہی بنا رہتا۔ مگر مجھے تمھارے سامنے ایک صفائی پیش کرنی تھی۔ میرے دوست! تم ذرا ضبط سے کام لو اور میری کہانی سن لو۔ پھر تم سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔''

زالیوکوس کچھ بھی نہ بولا۔ چپ چاپ سلیم کی طرف دیکھتا رہا۔ سلیم نے اپنی کہانی خود شروع کی:......

میرے والدین عیسائی تھے اور اسکندریہ میرا وطن تھا۔ مجھ ناچیز کے پدر بزرگوار اسکندریہ کے قونصل تھے۔ جب میں دس برس کی عمر کو پہنچا تو میری تعلیم و تربیت کی ذمے داری میرے ایک ماموں نے لے لی جو فرانس میں رہتے تھے۔ فرانس میں جس سال انقلاب آیا اس کے چند برس بعد میں اپنے ماموں کے ساتھ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا کہ وہاں ان کی جان کو خطرہ تھا۔ ہم نے یہ طے کیا کہ ہم اسکندریہ جائیں گے اور وہاں سکون کی زندگی گزاریں گے۔

''آخر کار، ہم اسکندریہ پہنچے، مگر یہاں بھی بدبختی ہمارا

تعاقب کررہی تھی۔ اسکندریہ آنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ میرا بھائی جو ایک لائق اور ہونہار نوجوان تھا، اس نے کچھ ہی دنوں پہلے فلورنس کے ایک رئیس کی بیٹی سے شادی رچائی تھی۔ ہمارے اسکندریہ پہنچنے سے دو روز پہلے اچانک اس کی دلھن غائب ہوگئی۔ ہمارے گھر والوں نے شہر بھر میں منادی کروائی۔ چاروں طرف اپنے آدمی بھیجے لیکن کہیں بھی اس لڑکی کا سراغ نہ ملا۔ انھوں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھانے کی کوشش کی شاید ڈاکوؤں نے زیورات کے لالچ میں اس کی جان لے لی ہو اور مار کر لاش کہیں چھپادی ہو۔ مگر ایسا بھی ہوا ہوتا تو شاید بہتر ہوتا۔ انھیں یہ معلوم ہوا کہ اس عزیزہ کو ایک اور نوجوان سے محبت تھی۔ اسی کے ساتھ وہ کہیں فرار ہوگئی۔

کسی نے بتایا کہ میرے بھائی کی بیوی اور وہ نوجوان اطالیہ کی سمت گئے ہیں۔ سو میرا بھائی اور میرے والدین دونوں اطالیہ پہنچے۔ انھوں نے جی توڑ کوشش اس بات کی کی کہ ان نابکاروں کو اپنے کیے کی سزا ملے، مگر ناکام رہے۔ اے عزیز! ابھی ان کی ذلت اور خرابی کے سلسلے کو اور آگے جانا تھا۔ اس مغرور لڑکی کے باپ سے جب میرے پدر بزرگوار اور بھائی کی ملاقات ہوئی تو اس نے وعدہ کیا کہ اپنی بیٹی کو اس کے کیے کی سزا دے گا۔ لیکن یہ

سب دکھاوے کی باتیں تھیں۔ اس نے خدا جانے کیوں میرے بھائی کے خلاف بہت کچھ سوچ رکھا تھا اور یہ طے کیے بیٹھا تھا کہ ہمیں تباہ کردے گا۔

اس کمینے کی رسائی حکومت کے اعلا عہدے داروں تک تھی۔ ان سے ساز باز کر کے اس نے میرے پدر بزرگوار اور میرے بھائی کو مشکوک کردار کا آدمی ٹھہرایا اور جھوٹی سچی شکایتیں ان کے خلاف درج کرادیں۔ دونوں غریب گرفتار کر لے گئے۔ انھیں فرانس بھیج دیا گیا۔ میری دکھیا ماں اس صدمے کی تاب نہ لاسکی اور اپنے حواس کھو بیٹھی۔ اس واقعے کے دس ماہ بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا۔ موت سے پہلے ایک روز، جب اس کے ہوش کچھ بجا تھے، اس نے مجھے طلب کیا۔ میں نے خدمت میں اس عفیفہ کے حاضری دی۔ اس نے کہا: ''اے فرزند! تو نے دیکھا کہ اس بدچلن لڑکی کے باپ نے تیرے پدر کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟ اب تو اس رسوائی کا انتقام لے۔ نہیں تو دودھ نہیں بخشوں گی۔'' یہ میری ماں کے آخری الفاظ تھے۔ میں نے جی میں ٹھانی کہ جب تک اپنے پدر کے دشمن کو کیفرِ کردار تک نہ پہنچاؤں گا، زندگی کی کسی آسائش کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ میں نے اپنی ماں کے سامنے یہ عہد دہرایا۔ پھر اس

نے آنکھیں موند لیں۔ جب سے غصے اور نفرت کی آگ میرے سینے میں بھڑک رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ یا تو خود اس آگ میں جل جاؤں گا یا اپنے پدر کے دشمن کو جلا کر خاک کر دوں گا۔

میں نے فلورنس کی راہ لی۔ وہاں اپنا کاروبار جمایا۔ اپنا اصلی نام لوگوں سے چھپائے رکھا۔ میں نے دشمن کو خاک میں ملانے کا جو منصوبہ بنایا تھا اسے پورا کرنا سہل نہ تھا۔ وہ نابکار اب ترقی کر کے گورنر بنا بیٹھا تھا اور ہماری تاک میں تھا۔ اِدھر میں بھی اس کی ٹوہ میں لگا ہوا تھا۔

ایک شام شہر کی شاہراہ پر مجھے ایک شخص دکھائی دیا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ گورنر کا ملازم بوڑھا پیٹرو تھا۔ میں اس شخص کو اسکندریہ سے جانتا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اپنے مالک سے خوش نہیں ہے۔ میں نے اس بوڑھے سے لگاوٹ کی باتیں کیں۔ اسے شیشے میں اتار لیا۔ رشوت کے طور پر میں نے اسے چند اشرفیاں دیں۔ بوڑھا لالچی تھا۔ مفت کی دولت پا کر پوری طرح قابو میں آ گیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ رات کو/کسی وقت بھی، جب میں چاہوں، وہ اپنے مالک کی حویلی کا دروازہ چپکے سے کھول دے گا۔ میں نے دل میں طے کر رکھا تھا کہ اس کی بیٹی کو جان سے مار ڈالوں

گا کیونکہ اس نابکار کی وجہ سے میرے خاندان کو اس خرابی سے گزرنا پڑا۔ مجھے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی بنا کا کے عقد ثانی کی تیاریاں کر رہا ہے۔

میں نے بنا کا کو موت کے گھاٹ اتارنے کا ارادہ تو کر رکھا تھا مگر مجھے شک تھا کہ اپنے ہاتھوں یہ فریضہ انجام دے سکوں گا یا نہیں۔ بوڑھا پیرو بھی شاید اس کام کے لیے زیادہ مناسب نہیں تھا۔ میں کرایے کے کسی قاتل کا انتظام بھی کر سکتا تھا۔ گو کہ یہ بات خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ پیڑو سے مشورہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ تم اس شہر میں اجنبی ہو۔ ایک تو پردیسی ہو، دوسرے طبیب بھی ہو۔ اس لیے تم یہ کام کر سکتے ہو۔ سو میں نے وہ سوانگ رچایا اور تم چکر میں آ گئے۔

اس رات جب بنا کا کا قتل ہوا، حویلی کا دروازہ بوڑھے پیڑو ہی نے کھولا تھا۔ میں تمھارے وہاں پہنچنے کے بعد رخصت ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب میں واپس آیا تو وہاں نہ تم نظر آئے نہ بوڑھا پیڑو۔ حویلی کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ تم بحفاظت وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ اگلی صبح مجھے رات کا قصہ معلوم ہوا۔ میرے ضمیر پر ایک بوجھ

تھا۔ ڈر کا بوجھ بھی تھا۔ میں روم کی سمت بھاگ کھڑا ہوا۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ جب مجھے وہاں پہنچنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ایک یونانی طبیب قتل کے الزام میں گرفتار ہو گیا ہے تو مجھے کتنی اذیت کا احساس ہوا۔ آخر تم محض میری وجہ سے اس حال کو پہنچے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ آگے جو کچھ بھی ہو اس سے بے خبر نہ رہوں۔ سو میں فلورنس واپس آ گیا۔ جس روز تمھارا ہاتھ قلم کیا گیا میں وہیں تھا۔ میں نے بھیس بدل کر سارا قصہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جب تمھارا ہاتھ کاٹا گیا تو میں نے طے کیا کہ اب زندگی بھر تمھیں کوئی اور دُکھ نہ پہنچنے دوں گا۔

اے عزیز! اب یہ اور سنو کہ میں تمھارا پیچھا کیوں کرتا رہا۔ میرے ذہن پر اس بات کا بوجھ تھا کہ تم نے مجھے معاف نہیں کیا ہے۔ سو میں چاہتا تھا کہ تم سے ایک بار پھر معافی کی التجا کر لوں۔"

"اے رفیق! میں نے یہ سوچ کر دل کو سمجھا لیا کہ تم مجھ سے زیادہ بدبخت ہو۔ تمھیں عمر بھر تمھارا ضمیر کچوکے لگاتا رہے گا۔ میں صدقِ دل سے تمھیں معاف کرتا ہوں۔ خدا بھی تمھیں معاف کرے گا۔ بس مجھے ایک بات بتا دو! یہ کہ تم اس صحرا میں کس لیے آئے تھے؟ اور جب سے تم نے قسطنطنیہ میں میرے لیے وہ شاندار

مکان خریدا ہے تم خود کیا کرتے رہے ہو؟''

سلیم نے جواب دیا: ''اے عزیز! میں اسکندریہ واپس چلا گیا۔ میرے دل میں تمام انسانوں کے لیے ایک نفرت سی پیدا ہوگئی تھی۔ بس مسلمان مجھے اچھے لگتے تھے کہ سیدھی سادی بااصول زندگی گزرتے تھے اور تعیش کے ہر سامان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو زیادہ مسرور پایا۔ اسکندریہ میں مجھے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا جب میرے وطن کی فوجیں وہاں آ پہنچیں۔ انھیں میں میرے پدر اور بھائی کے قاتل بھی تھے۔ میں نے اپنے دوستوں کو جمع کیا جو میرے ہم خیال تھے اور بہادر مملوکوں کا اپنا دستہ اپنے ساتھ کر لیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی میں نے خاموشی کی زندگی نہیں گزاری۔ تب سے اب تک، اپنے رفقا کے ساتھ میں ایک بے چین گرچہ آسودہ حال زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میرے ساتھی مجھے اپنا مالک ومختار سمجھتے ہیں۔ ان میں یوروپی لوگوں جیسی نفرت، خودغرضی اور حسد نہیں ہے۔ وفاداری میں ان کا جواب نہیں۔''

زالیوکوس نے اس کہانی کے لیے اجنبی سوار کا شکریہ ادا کیا اور اسے اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دی۔

سلیم کا جی بھر آیا۔ اس نے محبت آمیز نظروں سے زالیوکوس کی جانب دیکھا اور بولا: "اے مہربان دوست! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے مجھے واقعی معاف کردیا ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ اس نیکی کا شکریہ ادا کرسکوں۔"

یہ کہہ کر سلیم سروقد اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ زالیوکوس نے اس کے شاہانہ اور شانہ دار سراپا پر ایک نظر ڈالی۔ سلیم نے پھر کہا: "اے عزیز! تمھاری دعوت میرے لیے پُرکشش ہے۔ مگر میں اسے قبول نہیں کرسکتا۔ میرے گھوڑے کی زین کسی ہوئی ہے۔ میرے ساتھی اور خدّام میرے منتظر ہیں۔ خدا تمھیں اپنی امان میں رکھے۔ اب مجھے رخصت کی اجازت دو میرے دوست۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو گلے سے لگایا اور گریہ کیا۔ زالیوکوس نے رخصت ہونے سے پہلے بس ایک بات اور دریافت کی۔: "تمھارا نام کیا ہے؟ اصل نام؟"

اجنبی سوار نے گہری نظروں سے زالیوکوس کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں تک چپ کھڑا رہا۔ پھر اپنی بھاری آواز میں بولا: "لوگ مجھے صحرا کا شہنشاہ کہتے ہیں اور کچھ۔ مجھے بس لٹیرا سمجھتے ہیں۔

میرا نام ازبذان ہے۔"

تو اے عزیزو! داستان ازبذان لٹیرے کی یہاں پہنچ کر تمام ہوتی ہے!

اس کہانی کی کہانی

عزیزو! داستان اربذان لٹیرے کی اب آپ نے ختم کرلی ہے، تو آپ کو ہم یاد دلادیں کہ کہانیوں کا یہ سلسلہ اس کتاب کے ساتھ ساتھ، پچھلی دو کتابوں میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ یہ دو کتابیں ہیں ''بھوتوں کا جہاز'' اور ''کٹا ہوا ہاتھ''۔ میں نے یہ کہانیاں آج سے تقریباً چالیس برس پہلے، انگریزی سے ہندی میں منتقل کی تھیں۔ اس زمانے میں، مدھیہ پردیش کے شہر اندور سے، ہمارے دوست مہیندر جوشی صاحب ''بچوں کا اخبار'' نکالتے تھے۔ پہلے پہل یہ کہانیاں اسی اخبار میں چھپیں۔ ۱۹۷۶ء میں، میرا دلّی آنا ہوا تو رسالہ پیام تعلیم کے سابق مدیر، مرحوم ولی شاہ جہاں پوری صاحب اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے جنرل منیجر، شاہد علی خاں صاحب

نے فرمائش کی کہ انھیں اردو میں بھی چھپنا چاہیے۔ سو، اب میں نے ایک بار پھر سے یہ کہانیاں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیں۔ ان کہانیوں کے انگریزی مصنف نے، یہ سارا مواد کچھ تو الف لیلہ سے حاصل کیا تھا، کچھ اپنی طرف سے ملایا تھا۔ ترجمہ کرتے وقت میں نے بھی اردو زبان کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے جگہ جگہ تبدیلیاں کی اور کچھ اضافے کیے۔ یہ کہانیاں جب تک پیام تعلیم میں چھپتی رہیں، اور پھر کتابی شکل میں سامنے آئیں، انھیں بچے اور بڑے، سبھی شوق سے پڑھتے رہے۔ ان میں حیرتوں کی ایک عجیب دنیا آباد ہے۔ ہر کہانی اپنے آپ میں مکمل ہے۔ مگر آپ کو اصل مزا اس وقت آئے گا جب آپ یہ داستان شروع سے آخر تک، یعنی اس سلسلے کی پہلی کتاب سے لے کر اس آخری کتاب تک، ایک ساتھ پڑھیں گے۔

ہمارے زمانے کے ایک مشہور مغربی قصہ نویس کا خیال ہے، کہ دنیا میں یوں تو ہزاروں پری کتھائیں لکھی گئی ہیں۔ [ہمارا ملک ہندستان اس میدان میں ہمیشہ سے بہت آگے رہا ہے۔ پرانے وقتوں میں، کتھا سرت ساگر، پنچ تنتر اور جاتک کتھائیں یہیں لکھی گئیں۔ انھیں آج بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے]

لیکن جو بات الف لیلہ کی کہانیوں میں ہے، کہیں اور نہیں۔ الف لیلہ کی کہانیوں کے جادو کا کچھ اندازہ آپ کو ان کہانیوں سے بھی ہوگا، کیونکہ ان کہانیاں کے اندازِ بیان پر، الف لیلہ کے قصوں کے راویہ، شہرزاد کی چھاپ بہت گہری ہے۔

پڑھنے میں تو یہ کہانیاں اچھی لگتی ہی ہیں، لیکن انھیں اگر کسی اور سے سنا جائے تو واقعی دوگنا لطف آتا ہے۔ میں نے، یہ کہانیاں اپنے ننھے منے نواسے اور نواسیوں، عثمان، انعم، منیزہ اور سامیہ کو سنائیں تو کچھ ایسا ہی تجربہ سامنے آیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ جب انھیں پڑھیں گے، یا پڑھوا کر سنیں گے، تو آپ بھی کچھ ایسے ہی تجربے سے گزریں گے۔

میں مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ایک بار پھر، نئے سرے سے ان کہانیوں کی اشاعت کا ذمہ لیا اور اس خوبصورتی کے ساتھ انھیں شائع کر رہے ہیں۔

جس دور میں یہ کہانیاں پہلی بار ہندی میں اور اس کے بعد اردو میں سلسلے وار سامنے آئیں، بچوں کے لیے میں نے بہت سے قصے لکھے اور دوسری زبانوں سے ترجمہ کیے۔ ان میں دیس بدیس

کی لوک (عوامی) کہانیوں اور ہندستان کے مختلف علاقوں میں سنی سنائی جانے والی کہانیوں کا ایک سلسلہ بھی شامل تھا۔ آقائی سعید نفیسی کے ایک (فارسی) ڈرامے ''آخریں یادگار نادر شاہ'' کا اردو ترجمہ بھی میں نے اپنی کالج کی تعلیم کے دوران کیا تھا۔ بچوں کے لیے لکھنا، ایک نہایت دلچسپ اور حیران کن تجربے سے گزرنا ہے۔ بچے قصہ کہانیوں کے غیر معمولی سامع ہوتے ہیں۔ ان کا مقابلہ بڑی عمر کے لوگ، چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔ بڑوں کے تخیل میں نہ تو بچوں کی جیسی زرخیزی اور تیزی ہوتی ہے، نہ ان کا جیسا تجسس۔ افسوس کہ ہمارے معاشرے میں بچوں کی جمالیاتی قدر اور طلب کا احساس اور بچوں کے ادب کی اہمیت کا شعور زیادہ عام نہیں ہے۔ نامور اور ممتاز لکھنے والوں میں سے بس گنتی کے کچھ لوگ بچوں کے لیے لکھنے کا وقت نکالتے ہیں۔ اور اب تو فلموں اور ٹیلی ویژن کے چلن اور مقبولیت نے کتاب کی دنیا پہلے سے زیادہ محدود کر دی ہے۔ لیکن فلم ہو یا ٹیلی ویژن، ان میں سے کوئی بھی، کتاب کی جگہ نہیں لے سکتا۔ کتاب ہماری بہترین ساتھی ہے۔ اسی لیے مغرب کی بڑی زبانوں میں، ہمارے اپنے ملک کی کئی زبانوں مثلاً ملیالم اور بنگالی میں، بچوں کے لیے بہت اعلا درجے کا ادب تخلیق کیا

جا رہا ہے۔ کئی جانے مانے ادیب، بچوں کے لیے بہت شوق سے اور توجہ کے ساتھ لکھتے ہیں۔ یہ روایت ہماری اپنی زبان اردو میں بھی کچھ عرصہ پہلے تک عام تھی۔ اس روایت کو نئے سرے سے زندہ رکھنے اور ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ اور اس کام میں بڑے اور بچے، دونوں ایک دوسرے کے مددگار ہو سکتے ہیں۔ بچوں میں پڑھنے کا شوق بڑھے گا تو بچوں کے لیے لکھنے والوں کی سرگرمی میں بھی اضافہ ہوگا۔ بازار میں جس چیز کی مانگ نہ ہو، دھیرے دھیرے ختم ہو جاتی ہے۔

۱۴، ذاکر باغ
نئی دہلی۔ ۲۵

شمیم حنفی
۳ر مئی ۲۰۰۶ء

ایک بونے کا قصہ

شمیم حنفی

مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۲۵